Regd. L. No.7243
Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1982ء

صدر مملکت نے کہا : معاشرہ کی کمزوریاں
فاروقیت اپنائے بغیر دور نہیں ہو سکتیں ۔

فاروقیت کیا ہے ؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور
قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون ۸۸۰۸۰۰	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان ۳۶/- روپے غیر ممالک ۸۶/- "	خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۵	اکتوبر ۱۹۸۲ء	شمارہ ۱۰

فہرست

۱۔ لمعات ---------- ۲

۲۔ قرآنک کالج کے متعلق اعلان --- (چیئرمین قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) ---- ۶

۳۔ قرآنی درس کے اعلانات ---------- ۸

۴۔ فاروقیت کیا ہے؟ ---------- ۹

۵۔ محشرستانِ فلسطین --- (قسط ۲) ---------- ۱۴

۶۔ حقائق و عبر --- (داعیانِ اقامتِ دین کا اسلام) ---- ۶۲

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹ ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

صدر مملکت نے، یوم آزادی (۱۴ اگست ۱۹۸۲ء) کی تقریب پر، اپنے خطاب میں ایسے درخشندہ عزائم کا ذکر کیا تھا جنہیں سال آئندہ کے لئے مملکت کا لائحہ عمل کہنا چاہیئے۔ انہوں نے کہا تھا کہ

آیئے ہم عہد کریں کہ ہم پاکستان میں بہتر، مضبوط تر اور خوشحال تر معاشرہ تعمیر کریں گے اور اس سلسلہ میں انشاء اللہ کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ ہم اس ملک میں ایک صاف ستھرا معاشرہ قائم کریں گے۔ یک جہتی کو فروغ دیں گے۔ ایمان، اتحاد اور تنظیم کے اصولوں سے اس گھر کو سجائیں گے۔ اور یہاں اسلامی اصولوں کے مطابق انشاء اللہ فلاحی مملکت قائم کریں گے۔ ایسی فلاحی مملکت جس میں غریب لاچار نہ ہوں۔ جہاں اسلامی اقدار کے مطابق امیر، غریب کا خیال رکھے۔ بڑا چھوٹے سے محبت کرے۔ چھوٹا بڑے کی عزت کرے۔ اولاد ماں باپ کا احترام کرے۔ اساتذہ جواں نسل کی راہنمائی کریں، اور طلبا، اساتذہ کی عزت کریں۔ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوئی ہوں۔ نظام زکوٰۃ مزید بہتر اور بامقصد ہو۔ مستحق کو زکوٰۃ فعال طریقے سے پہنچے۔ غرضیکہ پاکستان میں ایک باعمل اور باکردار پاکستانی معاشرہ قائم ہو۔ ہم غربت و افلاس اور تنگ نظری اور جہالت کے خلاف جہاد کریں گے۔

(بحوالہ ہفت روزہ۔ المنبر ۲۱ تا ۲۷ اگست ۱۹۸۲ء)

انہوں نے خصوصیت سے کہا کہ

ہمارے ہاں اس وقت سب سے بڑی لعنت جس نے معاشرے کو غلیظ تر بنا دیا ہے، وہ رشوت اور سفارش ہے۔ آیئے کوشش کریں کہ ان کا خاتمہ کر دیں۔ لیکن زبانی کلامی یہ لعنت ختم نہیں ہو گی۔ اس کے خلاف تو بہت سخت جنگ کرنا پڑے گی۔ میں آپ کو ایک سال کی طویل جنگ کا اعلان کرنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ آیئے، اس جنگ میں شریک ہوں۔ رشوت اور سفارش کو ختم کریں اور معاشرے کو اس لعنت سے پاک کریں۔

(ایضاً)

انہوں نے رشوت، سفارش کے علاوہ، نظام عدل، نظام معیشت، نظام تعلیم۔ وحدت ملی اور استحکام پاکستان کے سلسلہ میں بھی اسی قسم کے جہاد کی تلقین کی۔

یہ آرزوئیں جس قدر مقدّس اور یہ عزائم جس قدر بلند ہیں، ان میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ پہلی بار نہیں کہ صدرِ مملکت نے ان کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ کم و بیش اپنے ہر خطاب میں ان کا اعادہ کرتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود معاشرہ میں اصلاح کیوں نہیں ہو رہی؟ اس کا اعتراف انہوں نے خود اس خطاب میں بھی کیا ہے جب کہا ہے کہ ان پانچ برسوں میں:۔

ہم اہلِ وطن کو وہ خوشحالی اور وہ مکمل احساسِ تحفظ بھی نہیں دے سکے جس کے ہم خواہاں تھے۔ ہم نے چادر اور چار دیواری کا ذکر تو کیا اور کسی حد تک نبھایا بھی، لیکن ہم عوام کی توقعات پر پورے نہیں اُتر سکے۔ چوری، ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔ دھوکہ دہی اور جعل سازی موجود ہے اور تجارت میں ایمان داری کا فقدان ہے۔ مگر ہم ناامید نہیں۔ ہماری کوششیں برابر جاری ہیں۔ (ایضاً)

سوال یہ ہے کہ ایسے پختہ ارادوں اور پُرعزم کوششوں کے باوجود، معاشرہ کی اصلاح کیوں نہیں ہو رہی؟ اس کا جواب خود صدرِ مملکت نے، اسی سال کے آغاز میں، عیدِ میلاد النبیؐ کی تقریب سعید پر دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا:۔

حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے دو گوشے متمیّز اور نمایاں ہیں۔ پہلا گوشہ مکی زندگی کا تیرہ سال کا عرصہ ہے اور دوسرا گوشہ مدینہ کی دس سالہ زندگی۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ مکی زندگی وعظ و نصیحت تک محدود تھی، اور مدنی زندگی، اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کے قیام کے لئے سرگرمیوں کا مرحلہ ——— لیکن حقیقت یہ نہیں۔ مکی اور مدنی زندگی ایک ہی پروگرام کی دو مسلسل کڑیاں تھیں۔ اسلامی نظام کوئی مشینری نہیں ہوتی کہ اسے کہیں سے درآمد کر کے اپنے ہاں نصب کر دیا جائے تو وہ چلنے لگ جائے۔ اسلامی نظام کی شرطِ اوّلین یہ ہے کہ ایسے افراد تیار کئے جائیں جو اس نظام کے قیام و استحکام کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔ حضورؐ کی مکی زندگی اسی قسم کے افراد تیار کرنے کے لئے وقف رہی، اور جب یہ افراد تیار ہو گئے تو اسلامی نظام کے قیام کے لئے عملی پروگرام کا آغاز کر دیا گیا۔ اس قسم کے افراد کے بغیر اسلامی نظام نہ قائم ہو سکتا ہے، نہ قائم رہ سکتا۔

حضورؐ کا یہ پروگرام، درحقیقت عملی تشریح تھی اس ارشادِ خداوندی کی کہ

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ..... (۱۳/۱۱)

(تم تو ایک طرف) خدا بھی کسی قوم کی خارجی دنیا میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی داخلی دنیا (ذہنیت و نفسیات) میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔

افرادِ معاشرہ کی ذہنیت میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کا طریق کار بتایا گیا تھا کہ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ..... (۶۲/۲) ان کے سامنے خدا کے اقدار و قوانین کو پیش کیا جائے۔ پھر ان کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب کی تعلیم دی جائے۔

اس تعلیم و تربیت سے ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کی جائے جو ان کے حسنِ کردار کی بنیاد بنے۔ اس کے ساتھ ہی یہ معلّم، خود اپنی زندگی کو بطور مثال پیش کرے۔ جب افراد کے قلب و نگاہ میں اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو جائے تو پھر اصلاحِ معاشرہ کے لئے عملی قدم اٹھایا جائے۔ اس کے بغیر اصلاحِ معاشرہ کی کوئی تدبیر کامیاب قرار نہیں پا سکتی۔ قوانین یا تعزیرات کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ ذہنیتوں میں تبدیلی کی رَو سے ہی ہو سکتی ہے۔ پاکستان کی پوری تاریخ میں، اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ آج کل "اسلامی تعلیم" کا بڑا چرچا ہے۔ لیکن یہ تعلیم ـــــ خواہ وہ مکتبوں اور دارالعلوموں میں ہو یا سکولوں اور کالجوں میں ـــــ کچھ معلومات تو بہم پہنچا دیتی ہے۔ قلب و نگاہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔ قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کرنا تو ایک طرف، ان معلومات کی وجہ سے، جو وضعی روایات اور مسخ شدہ تاریخ پر مبنی ہوتی ہیں، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ، نفسِ اسلام سے متنفر ہی نہیں، برگشتہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جو معاشرہ اس قسم کے افراد پر مشتمل ہو اس میں اصلاحِ احوال کی کونسی تدبیر کارگر ہو سکتی ہے؟ آرزوؤں کے خواب کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں، اگر ان کے بروئے کار لانے کا طریق کارگر نہ ہوں، تو وہ کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتیں۔

(۰)

حمیّت نام تھا جس کا.....

اقبالؒ نے ایک نظم میں اس خونچکاں داستان کا نقشہ کھینچا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب غلام قادر روہیلہ نے مغل شہنشاہ کی آنکھیں نوکِ خنجر سے نکال دیں تو بیگمات، اور شاہزادیوں کو رقص کا حکم دیا۔ وہ دیر تک ..... اس منظر سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنا اسلحہ ایک طرف رکھا اور خود سونے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ کچھ وقت وہ یونہی لیٹا رہا اور اس کے بعد اٹھ کر کہا کہ میرا یہ سونا جھوٹ موٹ کا تھا ؎

یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی — مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر — حمیّت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

(بانگِ درا)

اس عبرت آموز منظر سے یہ راز سارے زمانے پر کھل گیا ہو یا نہ، لیکن اب جو کچھ بیروت میں ہوا ہے، اور ہو رہا ہے، اس سے یہ راز تو یقینی طور پر ساری دنیا پر کھل گیا کہ حمیّت نام ہے جس کا، وہ مسلمان کہلانے والی ایک ارب آبادی کے گھروں سے رخصت ہو چکی ہے۔ پچھلے دنوں اسرائیلیوں کے ہاتھوں، فلسطینیوں پر جس قدر مظالم ہوئے وہی حمیّت کو آواز دینے کے لئے کم لرزہ انگیز اور قیامت خیز نہ تھے، لیکن بیروت کے کیمپوں میں جو کچھ ہوا، اس نے کرۂ ارض کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ بیچارے نہتے فلسطینی، اپنے بیوی بچوں سمیت، پناہ گزین تھے کہ مسلح ملیشیا، ان

کیمپوں میں جا گھسا۔ مردوں نے عورتوں اور بچوں کو گھیر کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور اس کثرت اور شدت سے باڑھ ماری کہ ایک ایک کے جسم سے کئی کئی گولیاں آر پار ہو گئیں۔ پھر ان کی لاشوں کے ساتھ اس قدر بہیمانہ سلوک کیا جس سے انسانیت کی آنکھیں بھی زمین میں گڑ گئیں۔ ان سطور کی تسوید تک (اطلاعات کے مطابق) قریب ڈیڑھ ہزار لاشیں جو گرمی کی شدت سے گل سڑ رہی تھیں، برآمد کی جا چکی ہیں۔ یہ خبریں کئی دنوں سے فضا میں ارتعاش پیدا کر رہی ہیں لیکن ایک ارب مسلمان قوم کے قلوب میں حمیت اور غیرت کو بیدار نہیں کر سکیں ——— وہ وہاں موجود ہو تو بیدار ہونے کی بھی توقع کی جا سکے۔ جب وہ وہاں سے رخصت ہی ہو چکی ہو تو پھر توقع کس بات کی کی جائے۔ مراکش سے انڈونیشیا تک مسلمان کہلانے والی قوم سمندر کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس بحرِ ذخار میں اسرائیلیوں کی چڑیا جتنی مملکت، جس کی کل آبادی لاہور جتنی بھی نہیں، اور جسے وجود میں آئے، چند سالوں سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، انہیں (مغل شہزادیوں کی طرح) ننگی کا ناچ نچا رہی ہے، اور یہ نمازوں میں دعاؤں۔ عرفات کے میدان میں التجاؤں۔ جلسوں میں قراردادوں۔ یو، این، او کے حضور درخواستوں سے آگے ایک قدم اٹھانے کی سکت بھی اپنے اندر نہیں پاتے۔ اگر یہ ایمان کی بنیادوں پر اُمّتِ واحدہ تو ایک طرف، عام دنیاوی معیاروں کے مطابق ہی ایک قوم ہوتے تو دنیا کی کوئی طاقت ان کی طرف نگہِ بد سے نہ دیکھ سکتی۔ قومیں مرتی ہیں تو ان کے جنازے نہیں اٹھا کرتے۔ وہ جیتی جاگتی۔ چلتی پھرتی، جہنم کی زندگی بسر کرتی ہیں جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى …… (۸۷/۱۳) "اس میں نہ زندگی نصیب ہوتی ہے، نہ موت ہی آتی ہے۔ يَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّمَا هُوَ بِمَيِّتٍ …… (۱۴/۱۷) "انہیں ہر طرف سے موت آتی دکھائی دیتی ہے لیکن وہ مرتے بھی نہیں کہ اس پیہم عذاب سے چھوٹ جائیں۔" جن قوموں میں حمیت اور غیرت نہ رہے ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن!

(محررہ ۲۱/۹/۸۲)

(۰)

وحدتِ ملّت!

شاہ احمد نورانی کی جماعت کے ترجمان "ترجمانِ اہلِ سنّت" کی ستمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع ہوئی ہے:۔

اس وقت صرف کراچی میں ساٹھ سے زائد مساجد کے مقدمات مختلف عدالتوں اور مراحل میں زیرِ سماعت و زیرِ تفتیش ہیں۔

اور محترم نورانی صاحب ان نمازیوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے "گول میز کانفرنس" کا اہتمام فرما رہے ہیں!

(۰)

قرآنک کالج

(سابقہ اعلان کا اعادہ)

طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں، یہ اعلان پڑھنے کے بعد کہ قرآنک کالج کی سکیم، ناقابلِ عبور موانعات کی بنا پر ترک کر دی گئی ہے، وہ مخلص احباب جن کی اس سکیم کے ساتھ مقدّس آرزوئیں وابستہ تھیں تڑپ تڑپ اُٹھے۔ یہ عین توقع کے مطابق تھا۔ ان میں سے بعض نے مجھے بڑے دردانگیز "تعزیت نامے" تحریر فرمائے ہیں، جنہوں نے مجھے رُلا رُلا دیا۔ میں ان کی خدمت میں اتنا عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس فیصلے سے ان کے دل پہ تو ایک ہی تیر لگا ہوگا۔ وہ میرے سینے میں جھانک کر دیکھیں تو اسے ہمہ تن داغ داغ پائیں گے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کچھ خوش دلی سے نہیں کیا گیا۔ حالات اس قدر نامساعد تھے کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

۲۔ عطیات کی واپسی کی پیش کش کے سلسلہ میں بعض احباب نے کہا ہے کہ انہوں نے یہ عطیات واپس لینے کے لئے نہیں دیئے تھے۔ میں انہیں اپنی صوابدید کے مطابق، دیگر مقاصد کے لئے صرف میں لے آؤں۔ انہیں میری ذات پر جو اعتماد ہے میں اس کے لئے ان کا بدل شکر گذار ہوں، اور انہیں یقین دلاتا ہوں کہ بتوفیقِ ایزدی اسے ٹھیس نہیں لگنے دوں گا۔

۳۔ بعض احباب نے کچھ متبادل تجاویز پیش کی ہیں۔ میں نے اُن کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ لیکن میں جب تک جملہ حالات کا بغائر اندازہ نہ کر لوں، کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا۔ فیصلہ درحقیقت ایک (COMMITMENT) بن جاتا ہے جس سے بڑی گراں بار ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے۔

۴۔ سابقہ اعلان میں، عطیات کی واپسی کے لئے جو طریق کار تجویز کیا گیا تھا اسے ذیل میں دھرایا جاتا ہے تاکہ جن معطیان کی نظر سے وہ اعلان نہ گذرا ہو، انہیں اس کا علم ہو جائے۔

۱۔ جن احباب نے اپنے عطیات، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کو براہِ راست بھیجے تھے، وہ اپنے مطالبہ کا خط (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی - 25/B - گلبرگ نمبر 2 لاہور) کے نام براہِ راست بھیج دیں۔ اس میں عطیہ کی رقم کے علاوہ اس رسید کا نمبر اور تاریخ بھی درج ہونی چاہیئے جو اس عطیہ کے موصول ہونے پر جاری کی گئی تھی۔ اگر وہ رسید موجود نہ ہو، تو طلوعِ اسلام

کے جس شمارہ میں وہ فہرست شائع ہوئی تھی جس میں وہ عطیہ درج تھا، اس کا حوالہ دیدیا جائے۔ مطالبہ خود معطیان کی طرف سے آنا چاہیئے۔ یہ ضروری ہے۔

ب:۔ اگر کسی صاحب نے اپنا عطیہ طلوعِ اسلام کی کسی بزم کی معرفت بھیجا ہو، تو وہ اپنا مطالبہ متعلقہ بزم کی وساطت سے بھیجیں اور وہ بزم ضروری حوالہ کے بعد، مطالبہ سوسائٹی کو بھیج دے۔

ج:۔ عطیہ کی رقم (احتیاطاً) کراس چیک کے ذریعے بھیجی جائے گی کہ یہی طریقہ زیادہ محفوظ ہوتا ہے۔

د:۔ بیرونی ممالک سے معطیان نے جو عطیات بھیجے تھے وہ ہمیں یہاں پاکستانی کرنسی میں وصول ہوئے تھے۔ ہم ان رقوم کو پاکستانی کرنسی ہی میں ادا کر سکتے ہیں۔ بیرونِ ممالک رہنے والے حضرات اس سے بھی مطلع فرمائیں کہ انہیں کس طرح یہ رقوم ادا کی جائیں۔

جن معطیان کو مطالبہ کے بعد دو ہفتہ کے اندر، چیک یا جواب نہ ملے، وہ براہِ کرم یاددہانی کا کارڈ ارسال فرمادیں، کیونکہ ہوسکتا ہے کہ ان کے مطالبہ کا خط ہم تک نہ پہنچ پایا ہو۔

۵۔ واضح رہے کہ واپسی کی یہ پیش کش، ان عطیات کے لئے ہے جو کالج کی تعمیر کے سلسلہ میں ادا کئے گئے تھے۔ اس میں وہ عطیات شامل نہیں جو شروع میں، قرآنک سوسائٹی کے لئے زمین خریدنے کے لئے (بحساب دو ہزار پانسو روپیہ فی کس) دیئے گئے تھے۔ زمین خرید لی گئی تھی اور وہ سوسائٹی کے دیگر مقاصد کے مصرف میں لائی جائے گی۔ لہٰذا اُن عطیات کی واپسی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۶۔ بعض احباب، قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ احباب کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی۔ (حتیٰ کہ) ادارہ طلوعِ اسلام تک میں التباس پیدا کر دیتے ہیں۔ اطلاعاً تحریر ہے کہ یہ تینوں تنظیمات بالکل الگ الگ ہیں ـــــ ان کا نظم و نسق بھی الگ الگ ہے اور حساب کتاب بھی الگ الگ۔

۷۔ آخر میں میں ایک بار پھر احباب کی مخلصانہ اعانت کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ اعلان آئندہ ماہ پھر شائع کر دیا جائے گا تاکہ اس فیصلہ کی زیادہ سے زیادہ پبلسٹی ہو جائے۔

والسلام

ایم دین

چیئرمین۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

۲۵/ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

ـــــــ (۰) ـــــــ

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جسے مقامی بزم ہائے طلوع اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈروں کے ذریعے حسب ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے :-

نوٹ :- پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپیں بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں -

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام درس کے کوائف :-
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD. TEL: 553-1896
برمنگھم (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر - (بمقام) 60. HERICK RD. SALTLEY, B8 INT.		
اوسلو (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا سنیچر شام ۷ بجے (بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO 1		
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE #311, DOWNS VIEW, TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827
کراچی ۱۲	ہر جمعہ ½۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوع اسلام کمرہ ۱۲ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ، نیو چالی۔ فون: ۲۲۸۸۲۸
پشاور	۱- ہر جمعہ ۵ بجے شام ۲- ہر جمعہ ۹ بجے صبح	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر (OPP: VIP. MAIN GATE) پشاور سٹیڈیم باڑہ روڈ فون ۷۲۶۵۹ ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ اتفاق بلڈنگ نواب علی روڈ
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۴۶ لیاقت روڈ
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس، شہید روڈ (لیہ)
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کمیال (ایبٹ آباد)
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی ۳/ مکان نمبر ۴ - نظامی منزل
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ عثمٰی پورہ باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خان صاحب۔
چکوال	ہر جمعہ ½۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نائب، بزم طلوع اسلام۔
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم الحق۔ رہائش گاہ: چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ۔ سول لائنز۔
گجرات - ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر بمقام ۱۲۰/بی بھمبر روڈ۔۔۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ		
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ تنزہ بیرون پاک گیٹ (فون: ۳۱۰۷۱)
مجلس تحصیل کبیر والا ملتان	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام مطب حکیم احسان الدین صاحب (نمائندہ بزم)
ہنگو	ہر جمعہ ½۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون ۲۵)
فیصل آباد	ہر جمعہ ½۲ بجے بعد دوپہر	بمقام حیات سرجری کلینک ۳/۳۳ پیپلز کالونی ۱ (فون ۲۸۵۵۰)

باسمہٖ تعالیٰ

صدرِ مملکت نے فرمایا کہ معاشرہ کی کمزوریاں،
فاروقیت اپنائے بغیر دُور نہیں ہوسکتیں۔
اِس سوال کا جواب کہ:

فاروقیتؓ کیا ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فاروقیت کیا ہے؟

روزنامہ جنگ (لاہور) نے اپنی ۱۶ اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت کے اداریہ میں، صدر مملکت، جنرل محمد ضیاء الحق کے یوم آزادی کے قوم سے خطاب کے حوالے سے لکھا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ

ہم وہ سب کچھ نہیں کر پائے جس کی ہم تمنا کرتے ہیں۔ ہم اہلِ وطن کو خوشحالی اور مکمل احساسِ تحفظ بھی نہیں دے سکے جس کے ہم خواہاں تھے۔ ہم نے چادر اور چار دیواری کا ذکر کیا، اور اسے کسی حد تک نبھایا بھی لیکن ہم عوام کی توقعات پر پورے نہیں اتر سکے۔ صدر نے اس ضمن میں چوری، ڈکیتی، راہزنی، دھوکہ دہی کی وارداتوں، نیز جعل سازی اور تجارت میں ایمانداری کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے اصلاحِ معاشرہ کے لئے جہاد کا اعلان کیا۔ انہوں نے غربت، افلاس، تنگ نظری اور جہالت کے خلاف جہاد کرنے کا بھی عہد کیا اور کہا کہ وہ معاشرے میں ایسا معیار قائم کرنا چاہتے ہیں کہ رشوت اور سفارش کی لعنت کا خاتمہ ہو جائے کیونکہ اس لعنت نے معاشرہ کو غلیظ تر کر دیا ہے۔ انہوں نے قوم کو بھی دعوت دی کہ وہ اس لعنت کے خلاف ایک سال کے طویل جنگ میں شریک ہو اور رشوت اور سفارش کو ختم کر دے ..... انہوں نے کہا کہ یہ برائیاں محض باتوں سے ختم ہونے والی نہیں ہیں۔ ان کو ختم کرنے کے لئے دعا کے ساتھ دوا کی ضرورت ہے۔ اور یہ دوا بھی صدر نے تجویز کر دی، جب کہا کہ

معاشرے کی کمزوریاں فاروقیت اپنائے بغیر دور نہیں ہو سکتیں

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ، یہ دیکھنے اور ماپنے کے لئے کہ معاشرہ میں اصلاح ہو رہی ہے یا نہیں، اور اگر ہو رہی ہے تو کس حد تک، صدرِ مملکت نے ایک ایسا مقیاس (ماپنے کا ذریعہ) تجویز کیا ہے جس سے ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں رہ سکتے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں اسلامی نظام قائم ہوگا۔ اسلامی قوانینِ شریعت

نافذ ہوں گے۔ ہم اپنی سیرت کو اسلامی قالب میں ڈھالیں گے، تو نظری طور پر تو یہ بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔ لیکن جب اسے عمل کے معیار پر پرکھا اور ناپا جائے تو اس میں ایک بنیادی کمی رہ جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ آج تک "اسلام" کا کوئی متفق علیہ مفہوم متعیّن نہیں ہوا۔ ہر فرقہ بلکہ ہر شخص کا اسلام کا مفہوم الگ الگ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ مفہوم نظری ہوتا ہے۔ محسوس شکل میں سامنے نہیں آتا۔ اس لئے متعیّن طور پر پرکھا اور ناپا نہیں جا سکتا کہ ہمارا نظام کس حد تک اسلامی ہو گیا ہے۔ اس میں خود فریبی یا مغالطہ آفرینی کا بڑا امکان ہوتا ہے۔ اسلامی نظام کا آغاز، حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں ہوا اور وہ تکمیل تک دورِ فاروقیؓ میں پہنچا۔ لہٰذا اُس دور کی معاشرتی، معاشی، سیاسی زندگی اور خود سربراہِ مملکت کے ذاتی کردار میں اسلامی نظام کا صحیح نقشہ منعکس ہو جاتا ہے۔ بنابریں صدرِ مملکت نے جو کہا ہے کہ ان خرابیوں کا ازالہ فاروقیت کو اپنائے بغیر نہیں ہو سکتا، اس سے ایک ٹھوس معیار سامنے آجاتا ہے جس سے ہم اپنے معاشرہ اور خود اپنی ذات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

دورِ فاروقیؓ کے متعلق متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان میں (ہمارے نزدیک) پرویز صاحب کی تصنیف "شاہکارِ رسالتؐ" کو خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے اسے الدّین (یعنی اسلامی نظام یا اسلامی مملکت) کے نقطۂ نگاہ سے مرتب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے تاریخ کے صرف ان واقعات کو قابلِ قبول سمجھا ہے جو قرآن کریم کے خلاف نہیں اور جن سے صحابۂ کبارؓ کی سیرتؓ کردار داغدار نہیں ہوتے۔ جہاں تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ آیا ہے، انہوں نے اس کی نشاندہی کر دی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ کتاب قابلِ اعتماد ہے۔ "فاروقیت" کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے تو اس پوری کتاب کا مطالعہ ضروری ہے، لیکن اس خیال سے کہ جملہ قارئین کے لئے شاید یہ ممکن نہ ہو، ہم اس سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کریں گے جن سے فاروقیت کے نمایاں خط و خال سامنے آجائیں گے۔ حوالہ شاہکارِ رسالتؐ کے صفحات کے ہیں۔

—(۰)—

خطباتِ خلافت

امورِ مملکت (خلافت) کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ نے دو خطبات ارشاد فرمائے۔ ایک مختصر تھا اور دوسرا قدرے مفصّل۔ یہ خطبات گویا (آج کل کی اصطلاح میں) مملکت کے منشور تھے۔ مختصر خطبہ میں آپ نے فرمایا:-

"لوگو! میں تمہیں میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہؐ کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں، ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔"[1]

---

[1] شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر میں دیکھتا کہ کوئی اور صاحب اس بار کو مجھ سے بہتر طور پر اٹھا سکنے کے قابل ہیں تو میں اسے قبول نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء)

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکسار کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے جو کہا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سختی کو نرمی سے بدل دیں گی وہ درست تھا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین[1] کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا:۔

بارِ الٰہا! میں سخت ہوں۔ مجھے حق کی موافقت۔ اپنی رضاطلبی اور احساسِ آخرت کے لئے نرم کر دے۔

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا، تو آپ نے دوسری دعا مانگی کہ

یا اللہ! میں کمزور ہوں مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں۔ لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا۔ تو آپ نے بارگاہِ رب العزت عرض کیا کہ

یا اللہ! میں بخیل ہوں۔ مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے۔ لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔

مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا:۔

ایھا الناس! اللہ نے میرے رفقاء کے بعد، مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہو گا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہو گی تو اس کے لئے میں حتی الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کرونگا۔ اگر غلط رویہ اختیار کریں گے تو انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہو گی۔ اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جائے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد پھر اپنے لئے ایک اور دعا مانگی جس میں کہا کہ

بارِ الٰہا! مجھے تفکر و تدبر قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور

---

[1] آمین عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ـــــ ہاں! یقیناً ایسا ہو گا ـــــ اس میں یقین کا تصور غالب ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ ایمان ہے جس کے بنیادی معنی اس یقین کے ہیں جس سے قلب کو امن (اطمینان) حاصل ہو۔

اس کے لوازمات پر غور کر سکوں۔

یا اللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (شاہکارِ رسالت۔ صفحہ ۵۵ - ۵۷)

مفصّل خطبہ میں آپ نے پہلے یہ بتایا کہ وہ رسول اللہ اور حضرت صدّیق اکبر کے زمانے میں سخت گیر کیوں تھے۔ اس کے بعد فرمایا:۔

"اور اب کہ، اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأت ایمانی رکھتے ہیں، تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں نہ رکھ دوں، تاآنکہ وہ حق کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔ لیکن اس تمام سختی کے باوجود، میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مالِ غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے۔ (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفاف کے لئے لوں، لیکن اسے ناحق نہ لوں۔

تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے گا میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔

اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلا ضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں۔ اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہ پرداخت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو۔ میرا ہاتھ بٹاؤ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔ تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب کا منتظر ہوں۔ جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اترے اور نماز پڑھائی۔" (حوالہ۔ صفحہ ۵۸)

واضح رہے کہ آج کل کی اصطلاح میں خلافت سے مراد اسلامی نظام یا اسلامی مملکت لی جائے گی۔ دورِ ملوکیت میں بادشاہت اور آمریت سب شامل ہوں گی۔

خلافت اور ملوکیّت (یا آمریّت) میں فرق

ایک دن حضرت عمرؓ نے حضرت سلمانؓ فارسی سے پوچھا کہ میں خلیفہ ہوں یا بادشاہ؟ انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے مسلمانوں سے ایک درہم (یا اس سے کم بھی) وصول کیا اور اسے صحیح مقام پر صرف نہ کیا تو آپ بادشاہ ہیں خلیفہ نہیں۔ (ص ۶۲)

اس پر آپ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں ایک صاحب نے کہا:۔

خلافت اور شہنشائیت میں فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے، نہ ناجائز خرچ کرتا ہے۔ الحمدُ للہ کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔ بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے۔ (ص ۶۲)

جیسا کہ آگے چل کر سامنے آئے گا، آپ کے نزدیک "جائز" وہ تھا جس کی اجازت قرآنِ مجید دیتا ہو۔ جس کی وہ اجازت نہیں دیتا وہ ناجائز ہے۔ آپ کے دور میں، عام مسلمانوں کے ذہن میں بھی خلیفہ اور بادشاہ کا فرق اس قدر واضح تھا کہ جب روم کے سفیر نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے؟ تو اسے جواب ملا کہ "مالنا ملك۔ بل لنا امیر"۔ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں، ہمارا صرف امیر ہے ——— اور قارئین کو معلوم ہوگا کہ امیر کے معنی ہیں صحیح راستے کی طرف راہ نمائی کرنے والا۔

اس کے بعد وہ اس سربراہِ مملکت (حضرت عمرؓ) کی تلاش میں نکلا، تو دیکھا کہ آپ اپنے چغے کو سر کے نیچے رکھے، بالو ریت پر دھوپ میں سو رہے ہیں اور آپ کا پسینہ پیشانی سے ٹپک کر زمین کو تر کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا اور بے ساختہ کہنے لگا کہ

عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔ ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے وہ بیدار رہتا اور خوف زدہ رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا دین برحق ہے۔ اگر میں قاصد کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو اسی وقت اسلام قبول کر لیتا۔ اب میں جا کر واپس آؤنگا تو اسلام قبول کر لوں گا۔ (ص ۳۷۶)

آپ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا کہ آپ اپنے تجربہ کی بنا پر بتائیے کہ خلافت کسے کہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ، میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ

خدا کے سامنے حساب دیتے وقت، یہ بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔ اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہو تو یہ خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔

خلیفہ کا کسی سے کچھ لینے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ مملکت کے واجبات وصول کرنے میں بھی یہ اصول کارفرما تھا کہ حکومت کسی شخص سے کچھ لینے کا حق اس وقت رکھتی ہے جب اس نے اس کے لئے کچھ مفید کام کیا ہو۔

ایک آزاد شدہ غلام (سعید) کا بیان ہے کہ میں حکومت کے واجبات جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو انہوں نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اپنی رقم واپس لے جا۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر آنا۔" (ص ۳۶۸) اس چھوٹے سے واقعہ سے جو عظیم اصول مستنبط ہوتا ہے وہ اسلامی اور غیر اسلامی مملکت میں فرق کے حدود کی ایک بیّن نشاندہی کرتا ہے۔

(۰)

خلیفہ کا وظیفہ اور ذاتی اخراجات

حضرت عمرؓ نے بطور سربراہ مملکت جو وظیفہ اپنے لئے مقرر کیا وہ حسب ذیل تھا:۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک گرمی کا ایک سردی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام۔ میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو حال ان کا سو حال میرا۔ (ص ۳۷۱)

اس کھانے کا معیار یہ تھا کہ ایک وقت میں صرف ایک سالن ہونا چاہیئے۔ اور وہ بھی اس پابندی کے ساتھ کہ ایک دفعہ کھانے میں گوشت اور دودھ آیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ دو سالن ہیں۔ ان میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی کھایا جائے گا۔ اور وہ بھی وہ جس کے متعلق اطمینان ہو کہ وہ عام مسلمانوں کو میسّر آسکتا ہے۔ (ص ۳۷۳)

ایک دفعہ کوفہ کا عامل آپ سے ملنے آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے اور اس کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آگیا۔ کھانے میں جَو کی روٹی۔ زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ آپ جَو کی روٹی کیوں کھاتے ہیں۔ گیہوں کی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ

اس وقت عمرؓ کو یقین ہے کہ مملکت میں ہر فرد کو جَو کی روٹی مل رہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائے گا جس دن اسے اس کا اطمینان ہو جائے گا کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ (ص ۳۷۳)

ایک دفعہ ایک دوست کے ہاں دعوت تھی جس میں جو کھانا سامنے آیا وہ قدرے پُرتکلف تھا۔ آپ نے میزبان سے کہا کہ

یہ تو ہمارے لئے ہوا۔ ان محتاجوں کے لئے کیا ہے جو بھوکے مر رہے ہیں اور جنہیں نانِ جویں تک میسّر نہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے لئے جنّت ہے۔ یہ سن کر آپ آبدیدہ ہو گئے اور کہا کہ

خالدؓ! اگر ہماری قسمت میں یہ ہے اور ان کے مقدر میں جنت، تو پھر سوچو کہ یہ فرق کتنا بڑا ہوا؟ (ص ۳۷۴)

قحط کے زمانے میں آپ نے التزام یہ رکھا کہ ایک مشترکہ دسترخوان پر (جو کچھ میسر آئے) سب مل کر کھالیں۔ انہی میں آپ خود بھی شریک تھے۔ آپ اس قسم کی غذا کے عادی نہیں تھے اس لئے آپ کی صحت خراب ہوگئی اور رنگت سیاہ پڑ گئی۔ رفقاء نے کہا کہ آپ یہ غذا نہ کھائیے۔ آپ نے فرمایا کہ میں یہ غذا اس لئے کھاتا ہوں کہ

اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مجھے ان کا احساس نہیں ہوگا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا؟ (ص ۳۷۴)

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔ (ص ۳۷۴)

حالتِ سفر میں

یہ تو رہا کھانے کا معاملہ۔ اب سفر کی کیفیت ملاحظہ فرمائیے۔ دین کے نظام میں حج میں شرکت، امیرالمومنین اور عمالِ حکومت کی سرکاری ڈیوٹی تھی۔ اس زمانے میں حج، انفرادی عبادت کا نام نہیں تھا۔ یہ اسلامی مملکت کے زیرِ اہتمام اُمّت کا اجتماع تھا جس میں مملکت سے متعلق اہم امور پر مشورے بھی ہوتے تھے اور لوگوں کی شکایات کا ازالہ بھی کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ یہ سفر کس "شان و شکوہ اور انصرام و انتظام" سے ہوتا تھا اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ

میں ایک دفعہ حج کے سفر میں حضرت عمرؓ کے ساتھ رہا۔ آپ کے لئے نہ کہیں خیمہ لگایا گیا، نہ سائبان۔ نہ کوئی عمارت ایسی تھی جس میں آپ آرام کر سکتے۔ جہاں آرام کرنا ہوتا، ایک چادر کسی درخت پر ڈال دیتے اور اس کے سائے میں ہم سب آرام کر لیتے۔ (ص ۳۷۵)

اس سادگی اور بے سروسامانی کے باوجود آپ اس کے اخراجات پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ حضرت یسارؓ بن نمیر کی روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس مرتبہ حج پر کل کیا خرچ آیا۔ میں نے کہا پندرہ دینار۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ ہم نے بیت المال کا بہت سا روپیہ اڑا دیا۔ (ص ۳۷۵)

مکان آپ کا وہی تھا جس میں آپ زمانۂ خلافت سے پہلے رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمرو بن العاصؓ نے انہیں اطلاع دی کہ انہوں نے صدرِ مملکت کے لئے مصر میں ایک مکان بنوایا ہے۔ اس پر آپ نے انہیں لکھا کہ "بھائی! ذرا سوچو۔ حجاز میں رہنے والے کا مصر میں مکان کیسے ہو سکتا ہے؟..... اس مکان کو

رفاہِ عامہ کے لئے کھلا رہنے دو۔" (صـ۳۷۵)

سفرِ بیت المقدّس

فتح بیت المقدّس کے وقت آپ جابیہ میں تشریف فرما تھے۔ بیت المقدس کے اسقف نے صلح کے لئے یہ شرط لگا دی کہ مسلمانوں کے سربراہِ مملکت خود آکر معاہدۂ صلح پر دستخط کریں۔ جابیہ سے بیت المقدّس تک آپ کے "شاہانہ" سفر کی تفصیلی روئیداد تاریخ کی مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔ اس کا ملخص یہ ہے:۔

"بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا یہ سربراہ فاتح ایران و روم کی حیثیت سے عازمِ سفر ہوا تو باین نمط کہ ایک اونٹنی پر سوار تھے جس پر ایک اونی کمبل پڑا تھا۔ یہ کمبل بحالتِ قیام بستر کا کام بھی دیتا تھا۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں بے رکاب کجاوے میں ایک دوسرے سے لگر لٹکا رہے تھے۔ خرجی کھال کی تھی جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اسے ضرورت کے وقت تکیہ بنا لیا جاتا تھا۔ ادھر اُدھر دو تھیلے لٹک رہے تھے جن میں سے ایک میں ستّو تھے اور دوسرے میں کھجوریں۔ سامنے پانی کا مشکیزہ تھا۔ رفقاء کی جماعت ساتھ تھی۔ آپ ہر روز صبح اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھتے۔ اپنا زادِ راہ دستر خوان پر رکھ دیتے جسے سب مل کر کھا لیتے۔ راستے میں چلتے بھی جاتے اور اپنے ہم سفروں کو دین کی تعلیم بھی دیتے جاتے۔ بعض روایات یوں ہے کہ ایک ایک اونٹ دو دو سواروں کے حصّے میں آیا تھا۔ اور آپ کا زمیل آپ کا غلام (ملازم) تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ ایک منزل آپ سوار ہوتے اور وہ غلام مہار پکڑتا اور دوسری منزل وہ (غلام) سوار ہوتا اور آپ مہار پکڑتے۔ ایک جگہ راستے میں پانی آگیا تو آپ اونٹنی سے اترے۔ موزے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے اور اونٹنی کو ساتھ لے کر پانی میں اُتر گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے دیکھا تو کہا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جس کی اہلِ زمین کے نزدیک بڑی عظمت ہے۔ آپ نے یہ کیا اور وہ کیا ہے۔ آپ نے سنا تو فرمایا۔

ہماری عزّت اسلام کا صدقہ ہے

"ابو عبیدہ! یہ بات تمہارے کہنے کی نہیں تھی۔ ہم سب سے زیادہ غریب، سب سے زیادہ حقیر اور سب سے زیادہ قلیل تھے۔ اللہ نے ہمیں اسلام سے عزّت دی۔ یہی ہمارے لئے وجہِ شرف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے اللہ کے سوا کسی اور سے عزّت طلب کی تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔"

بیت المقدّس سے کچھ فاصلہ پر تھے کہ سواروں کا وہ دستہ آپہنچا جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے استقبال کے لئے بھیجا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ آپ نمدے کا کُرتہ پہنے ہوئے تھے جس میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے، اور ان میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ ایک نئے ملک میں، اجنبی قوم کے ہاں فاتح کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اونٹنی کے بجائے اس ترکی گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور وہ لباس پہن لیں جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے لئے بھیجا ہے۔ آپ نے ان کا مشورہ قبول فرما لیا اور وہ لباسِ فاخرہ پہن کر ترکی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ چار ہی قدم چلے ہوں گے تو گھوڑے سے اتر گئے اور اپنے رفقاء سے کہا کہ "عزیزانِ من! تم میری اس لغزش سے درگذر کرو۔ اللہ قیامت میں تمہاری لغزش سے درگذر

کرے گا جس نخوت اور تکبر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ یقیناً تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتے۔" اس کے بعد وہ پوشاک اتار کر پھر وہی پیوند لگے کپڑے پہن لئے۔

آگے گئے تو حضرت ابوعبیدہؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت یزید بن سفیانؓ آپ کے استقبال کے لئے آئے۔ انہوں نے ریشمی کپڑے پہن رکھے تھے۔ آپ نے دیکھا تو سخت افروختہ ہوئے اور کہا کہ، تم لوگ اتنی جلدی بدل گئے۔ تم نے دو ہی برس میں اس قسم کی تن آسانی اختیار کر لی۔ اگر تمہارا یہی طرزِ عمل رہا تو، خدا کی قسم، خدا تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تمہاری حکومت اسے دے دے گا کہ حریر و اطلس پہننے والی قومیں حکومت کی اہل نہیں رہتیں۔ انہوں نے معذرت چاہی اور عرض کیا کہ امیر المؤمنین! ہم نے یہ کرتے، اس قوم کی خاطر اوپر سے پہن رکھے ہیں۔ دیکھ لیجئے ان کے نیچے وہی ہتھیار موجود ہیں۔ اس پر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔"

لیجئے! یہ "شاہانہ جلوس" داخلِ بیت المقدس ہو گیا۔ اُس قوم کا سردار، جلوس کے استقبال کے لئے آیا تو آپ نے اس سے فرمایا:۔

> میرا کرتہ سفر کی وجہ سے پھٹ گیا ہے۔ اسے دھو بھی دیجئے اور سی بھی لائیے۔ اور اتنی مدت کے لئے مجھے کوئی اور کرتہ دے دیجئے۔ اس نے وہ کرتہ بھی دھو اور سی دیا اور ایک اور کرتہ بھی تیار کر لیا اور کہا کہ اسے میری طرف سے قبول فرما لیجئے۔ آپ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور اس کا کرتہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا کرتہ اس سے زیادہ پسینہ جذب کرتا ہے۔

اس سردار نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا اچھے کپڑے پہن لیجئے اور گھوڑے پر سوار ہو جائیے۔ اس سے رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت بڑھے گی۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

ساری عزّت اسلام سے ہے

خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام سے ہے ان اضافی چیزوں سے نہیں۔ اس لئے ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

سچ ہے۔ جب تک مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے وجۂ عزت و شرف سمجھا وہ آسمانِ عظمت و وقار کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔ جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا تو ان بلندیوں سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح گرے اور فضائے زمانہ کی گردش میں پس کر راکھ ہو گئے۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بام بلندے " (حوالہ۔ مذ۲۔ ص۱۹۸)

اقربا پر پابندیاں

آپ نے ان امور میں جس قدر پابندیاں اپنے آپ پر عائد کر رکھی تھیں، ان سے کہیں زیادہ قدغن اپنے اہل و عیال پر بھی لگا رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کا معمول تھا کہ

جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے، ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف، اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دُگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے۔ جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دُگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی اسے دُگنی سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم مملکتِ اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔ (حوالہ۔ ص ۲۹۷)

بیوی کو تحفہ

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (گورنر) نے آپ کی بیوی (حضرت) عاتکہ کو ایک سجّادہ بطور تحفہ دیا جو گز بھر لمبا اور چند بالشت چوڑا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا تو حضرت ابوموسیٰؓ کو بلا کر سخت ڈانٹا۔ سجّادہ ان کے سر پر دے مارا۔ اور کہا کہ خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔

ملکۂ روم کا ہدیہ

ایک دفعہ شاہِ روم کا قاصد آیا تو ملکہ کی طرف سے "فرمانروائے مملکتِ اسلامیہ کی بیگم" کے لئے ہدیۂ سلام لایا۔ آپ کی بیوی نے ایک دینار قرض لیا، عطر خریدا، اور اُسے شیشیوں میں بند کر کے ملکۂ روم کو بھیج دیا۔ اس نے تحفہ موصول ہونے پر، انہی شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس بھیج دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے سارے جواہرات فروخت کر کے، ایک دینار بیوی کو دے دیا اور باقی رقم بیت المال میں داخل کر دی۔ اور بیوی کو آئندہ محتاط رہنے کی تلقین کی۔

خوشبو لگی رہ گئی

بیت المال میں خوشبو آتی تو آپ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے کہ وہ اسے فروخت کر کے رقم بیت المال میں جمع کرا دے۔ ایک دفعہ بیوی نے خوشبو بیچی تو جو انگلیوں سے لگی رہ گئی اسے اپنے دوپٹے پر مل لیا۔ خوشبو نے بہرحال غازی کر دینی تھی۔ اس نے کر دی۔ تو آپ نے بیوی سے کہا کہ تمہیں خوشبو بیچنے کے لئے دی گئی تھی، نہ اس لئے کہ تو مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے۔ یہ کہہ کر اس کے دوپٹے کو دھو ڈالا۔ اس پر بھی خوشبو نہ گئی تو اسے مٹی سے ملا۔ پھر سونگھا۔ اور جب تک خوشبو اُتر نہیں گئی، ایسا ہی کرتے رہے۔

مشک کا وزن

ایک دفعہ بحرین سے کچھ مشک آئی تو آپ نے کہا کہ کوئی عورت صحیح وزن کرنے والی مل جائے تو اس سے وزن کرا لیا جائے۔ آپ کی بیوی (عاتکہ) نے کہا کہ

میں خوب تولنا جانتی ہوں۔ لائیے۔ میں وزن کئے دیتی ہوں۔

آپ نے کہا کہ نہیں، تو نہیں۔ بیوی نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ تو مشک تولے گی۔ پھر جو ہاتھوں سے لگی رہ جائے گی اُسے سر اور گردن پر (یوں یوں) مل لے گی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے گی۔ میں یہ طرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

آپ کے بیٹے، حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا۔ وہ موٹے ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے آیا۔ اتفاق سے اسی وقت حضرت عمرؓ کا گذر ادھر سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا کہ

بیٹے کے اونٹ

ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیج دیا تھا۔ تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں، میں بھی اٹھاؤں۔

یہ سن کر آپ کو سخت غصہ آیا۔ کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ کہو کہ امیرالمؤمنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو۔ راس المال رکھ لو اور سارا منافع بیت المال میں جمع کرا دو!

حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہؓ اور عبیداللہؓ جہاد سے واپس آ رہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ روپیہ بیت المال میں

بیت المال کا روپیہ اور بیٹے

داخل کرنے کے لئے بھیجنا ہے۔ وہ لیتے جاؤ۔ میں وہ روپیہ تمہیں بطور قرض دیئے دیتا ہوں۔ تم اس سے کچھ عراقی مال خرید لو۔ مدینے جا کر مال بیچ دینا۔ اصل بیت المال میں جمع کرا دینا اور منافع خود رکھ لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہو گئی۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دے دیا تھا۔ اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟ انہوں نے کہا کہ سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک اس لئے کیا کہ تم امیرالمؤمنین کے بیٹے تھے۔ جاؤ! مال اور نفع دونوں بیت المال میں جمع کرو۔

مجلس مشاورت کے بعض رفقاء نے مداخلت کی تو بصد مشکل آپ اس پر راضی ہوئے کہ نصف منافع انہیں دے دیا جائے۔" (حوالہ۔ صـ ۲۱ - ۳۱۹)

ام المؤمنین حضرت حفصہؓ آپ کی چہیتی بیٹی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس کچھ مال آیا تو وہ آئیں اور کہا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دیجئے۔ فرمایا کہ تمہیں کیسے دے دوں؟ انہوں نے کہا کہ قرآن کریم میں اقربا کے ساتھ حسن سلوک کا حکم آیا ہے۔ اور میں آپ کے اقربا میں سے ہوں۔ یہ سن کر آپ مسکرائے اور کہا کہ بیٹی! باپ کو دھوکا دیتی ہو۔ وہ حکم ذاتی مال کے لئے ہے، اور یہ میرا ذاتی مال نہیں۔ مسلمانوں کا ہے اس

لئے اس پر قرآن کے حکم کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جاؤ بھاگ جاؤ۔ (ص ۳۲۲)

اِس سے بھی آگے بڑھئے۔

آپ کا معمول تھا کہ کوئی پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیزیں آتیں تو انہیں حصہ رسدی امہات المؤمنین (یعنی نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات) کو تحفتہً بھیجتے۔ حضرت حفصہؓ ام المؤمنین بھی تھیں، لیکن اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپ امہات المؤمنینؓ کے حصے لگاتے وقت، حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ آپ (حضرت حفصہؓ) کے حصہ میں ہو! (ص ۳۲۳)

احتیاط کی انتہا ملاحظہ فرمائیے:۔

(حضرت) معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کوڑے

ایک درہم

میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا، اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ امیر المؤمنین کا بلاوا آ گیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب اُمّتِ محمدؐیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔ (ص ۲۶۵)

یہ تو اقربا کی بات تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کسی رفیق سے کہا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بخشیئے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جو مراعات مجھے اس وقت حاصل ہیں ان میں سے کچھ چھیننے کا ارادہ ہے! اللہ اکبر ـــــ سربراہِ مملکت سے جس قدر قریبی تعلق، اتنی ہی کم مراعات! (ص ۳۲۲)

دیانت و امانت

دیانت کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ آپ کی طبیعت ناساز ہو گئی۔ علاج کے لئے شہد تجویز کیا گیا۔ شہد بیت المال میں موجود تھا لیکن امیر المؤمنین کے ہاں راشن میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے خود شہد نہیں لیا۔ کابینہ کی میٹنگ بلائی اور اس کی منظوری کے بعد شہد لیا۔ (ص ۳۲۳)

امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عمرؓ کے پاس تھوڑا سا دودھ لائے جسے پی کر آپ خوش ہوئے۔ پوچھا کہ یہ دودھ آپ کہاں سے لائے ہیں۔ اس نے کہا کہ فلاں چشمہ پر بیت المال کے اونٹ جمع تھے اور نگران ان کا دودھ دوھ رہے تھے۔ اس میں سے انہوں نے تھوڑا سا دودھ مجھے بھی دے دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حلق میں انگلی ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا اور فرمایا کہ بیت المال سے کچھ بھی بلا قیمت لینا جائز نہیں۔ (ص ۳۹۱)

اس دیانت اور امانت کا نتیجہ کیا تھا، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے۔ جب ایران (مدائن)

فتح ہوا تو اس کا مال غنیمت مدینہ پہنچا۔ اسے دیکھ کر اہل مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ زر و جواہرات، مال و دولت۔ نوادرات کی اتنی کثرت تھی کہ ان کا ذہن اسے باور نہیں کرتا تھا۔ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اس مال کو بھیجتے وقت، جو خط امیر المؤمنین کو بھیجا تھا اس میں لکھا تھا کہ اس مال کی کثرت یقیناً وجہ حیرت ہوگی لیکن اس سے بھی باعث مسرت امر یہ ہے کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کو ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر مرکز میں جمع کرا دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی۔

حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا کہ عمرؓ! تمہیں معلوم ہے کہ سپاہیوں کی اس دیانت اور امانت کا راز کیا ہے؟ وہ راز یہ ہے کہ

> چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیت ٹھیک نہ ہوتی تو رعایا کی نیت میں بھی فرق آجاتا۔ (ص ۱۸۲)

سربراہ مملکت کا کیریکٹر رعایا پر کس قدر اثر انداز ہوتا ہے، اس کا اندازہ اس (عمومی سے) واقعہ سے لگائیے۔

دودھ میں پانی ملانے والی لڑکی

ایک رات آپ گشت کرتے کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو۔ اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا۔ اماں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے دودھ میں پانی ملانے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا۔ اٹھو۔ اور دودھ میں پانی ڈال۔ اس جگہ کونسا امیر المؤمنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا۔ اماں! امیر المؤمنین نہیں دیکھ رہا، تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے جس کا حکم امیر المؤمنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصم سے اس کی شادی کر دی۔ (حوالہ۔ ص ۳۰۱)

یہی وہ اصول تھا جسے حضرت عمرؓ نے، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام اپنے ایک خط میں، ان الفاظ میں رقم فرمایا تھا کہ

> یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے زیادہ بدبخت وہ شخص

ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بگڑ جائے۔ (ص ۱۲۹)

اور اسی خط میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ

اگر تم یہ جاننا چاہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے ہاں ہے۔ (ص ۱۲۹)

قابلِ اعتماد کون ہے

نماز، روزہ احکام خداوندی کی اطاعت ہے (بلکہ اکثر اوقات انہیں محض عادتاً ادا کر لیا جاتا ہے) لیکن (حضرت عمرؓ کے معیار کی رُو سے) قابلِ اعتماد اسی کو سمجھا جا سکتا ہے جس کے لوگوں کے ساتھ معاملات درست ہوں۔ اس سلسلہ میں وہ واقعہ مشہور ہے کہ

ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

پھر پوچھا۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کہ

کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی معاملہ پڑا ہے؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ

پھر تم اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ لیا ہوگا۔ اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔ (ص ۲۴۴)

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی طرف جس خط کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، اس میں یہ بھی تحریر تھا کہ

جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے یکساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود سرانجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم انہی میں کے ایک فرد ہو، اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا پہنتے، ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں، جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ خدا کے بندے! سچ کہیں تیرا حال اس جانور کا سا نہ ہو جائے جس کا گذر ایک شاداب وادی پر ہوا تو سوائے پُرخوری اور فربہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہا، حالانکہ وہی پُرخوری اور فربہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے

اس کی رعیت بدبخت ہو جائے۔ (ص ۱۴۰)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ ہی کے لئے یہ ہدایات نہیں تھیں۔ آپ جب بھی کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے :-

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ مچل جائے۔ لوگوں کے کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضؓ کو لکھا :-

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تا کہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے نا امید نہ ہو جائے اور صاحبِ منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق سنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحبِ احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اسے برخاست کر دیتے۔

(۴) حضرت ابو عبیدہ رضؓ بن جراح کے نام ایک خط میں لکھا :-

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً، ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا . . . کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے)۔ (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سنا دیا جاتا تھا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمّال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :-

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب وہ احکام خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(۷) ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمان رضؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمان رضؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟

فرمایا۔ "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں۔" اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں قبیلہ ضبّہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، آلِ ضبّہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔

عصبیّتِ جاہلیہ کے خلاف

اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیّت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب، گروہ دو ہی ہوں گے۔ ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے گا۔

(۹) حضرت عمرو بن عاص رضؓ کو ایک خط میں لکھا ــــ اور غور سے سنیئے کہ کیا لکھا ــــ لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) ایک اور قول سنیئے اور جھوم جایئے۔ فرمایا:۔

نرمی بلا ضعف۔ سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو، لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں ــــ اور جس میں سختی ہو، لیکن استبداد کی بنا پر نہیں ــــ بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت ــــ یہ ہے اصل الاصول۔

ایک اور مقام پر فرمایا کہ "طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔"

(۱۱) حضرت مغیرہ رضؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہ رضؓ ایسا بن کر رہنا کہ پرامن تجھ سے بے خوف رہیں، اور بدمعاش خوف زدہ۔

(۱۲) ایک اور وجد آفریں قول ــــ فرماتے ہیں:۔

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔ جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور

کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا۔ اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۳) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی عبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا:۔

احنف! کپڑے اتار کر آجا اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا ـــــ امیر المؤمنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہوگا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے ـــــ کہا:۔

غلام کی طرح مخلص اور امین

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۴) ـــ عام تاکید یہ تھی کہ

گھر در سے بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ، کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ جھوٹا موٹا کھاؤ، گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھڑ سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو۔ ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

(۱۵) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا:۔

محاسبۂ خویش

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کیونکہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرضِ اکبر" (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔ (حوالہ۔ ص ۲۸۸ ـ ص ۲۹۱)

ایک دفعہ مصر کے حاکم حضرت فیاضؓ بن غنم کے متعلق شکایت پہنچی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے

راعی کے فرائض

دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ان کے عہدے سے معزول کیا۔ مدینے واپس بلا لیا اور ان سے کہا کہ

اپنی قمیض اتار کر کمبل کا جبہ پہنو۔ بکریوں کا ریوڑ لے کر جنگل کی طرف جاؤ اور بکریاں چراؤ اور ہر رہگذر کو پانی پلاؤ۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راعی کے فرائض کیا ہیں اور رعیت کے حقوق کیا! (ص ۲۲۴)

(ضمناً) راعی کے معنی ہی چرواہا ہیں۔ اس لفظ میں سربراہِ مملکت اسلامیہ کا صحیح مقام مضمر ہے۔

(۰)

عدل

اسلامی مملکت کے قیام اور وجود کی وجہ جواز ہی نظامِ عدل کا قیام ہے۔ عدل ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ ہم اس مقام پر صرف عدالتی عدل کی دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ مصر کے گورنر (حضرت عمروؓ بن عاص) کے بیٹے نے ایک قبطی کے بیٹے کو کسی بات پر تازیانوں سے پیٹا۔ وہ تازیانے مارتا جاتا تھا اور اس سے کہتا جاتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اس نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں

عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا معاملہ

کو بلا بھیجا۔ اعترافِ جرم پر آپ نے اس قبطی سے کہا کہ جس طرح اس نے تمہیں تازیانوں سے پیٹا تھا، اسی طرح تم اس کے تازیانے لگاؤ۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "مار ــــ بڑوں کی اولاد کو اور مار" جب وہ اُسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاصؓ) کے بھی مارو کہ اگر اس نے اس کی صحیح تربیت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا۔ سخت غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمروؓ بن عاص کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریمِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کی تابندہ دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

عمروؓ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

"ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا" ــــ یہ ہے قرآن کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسان کو، اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اور خود اپنے خلاف !

اپنے خلاف فیصلہ

حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر داغی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کر لو۔ اس نے کہا کہ میں شریحؒ کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔ انہوں نے ماجرا سنا تو کہا کہ امیر المؤمنین! یا گھوڑا خرید لیجئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اسے واپس کیجئے۔ آپ اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے اور شریحؒ سے کہا کہ آپ منصبِ قضاۃ کے لئے نہایت موزوں ہیں۔

یہی ہیں تو وہ مشہور قاضی شریحؒ جنہوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمال حسن وخوبی سرانجام دیا۔

حضرت عمرؓ عدالت میں

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ آپ ایک مقدمہ میں مدعی علیہ کی حیثیت سے حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے اُن سے کہا کہ زیدؓ! تم سے انصاف کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتدا ہی میں، فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے!! یہ کہہ کر مدعی کے قریب بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ فریقِ مخالف (ابی بن کعب) نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ان (مدعی) سے کہا کہ امیر المؤمنین سے قسم نہیں لینی چاہیئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ زیدؓ! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا۔ (حوالہ۔ صفحہ ۲۵)

(۰)

تکریمِ انسانیت

اور یہ بات تکریمِ انسانیت کی ہو رہی تھی۔ یہ تکریم مسلمانوں تک محدود نہیں تھی۔ قرآن مجید نے ہر بنی آدم (انسان) کو واجب التکریم قرار دیا ہے۔ اس میں اپنے اور بیگانے مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں۔ اس باب میں قرآنی تعلیم اور تربیتِ نبویؐ نے ان حضرات میں کیا تبدیلی پیدا کر دی تھی، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ ایک دفعہ حمص کے حاکم حضرت عمیرؓ بن سعد کی زبان سے ایک ذمی (غیر مسلم رعایا کے فرد) کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ——— اخزاك الله ——— خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ سیدھے بارگاہِ خلافت میں پہنچے اور یہ کہہ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنا استعفیٰ پیش کر دیا کہ میں نے ایک انسان کی تذلیل کی ہے۔ اس لئے میں اس منصب کا اہل نہیں ہوں۔ (صفحہ ۲۲۵)

مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن عاص نے ایک دفعہ ایک شخص کو منافق کہہ دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس

سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ ان سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو ورنہ میں آپ کو سزا دے دوں گا۔ (ص ۳۲۴)

یہ تو احترام انسانیت کی بات ہوئی۔ دوسری طرف، ایک شخص آپ کی تعریف کرنے لگا۔ تو آپ نے فرمایا:۔

کیا تو مجھے اور اپنے آپ دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے؟ (ص ۳۲۴)

خدا کا عبد (بندہ) اپنے فرائض کی ادائیگی، کسی صلہ کی امید یا معاوضہ کی توقع پر نہیں کرتا۔ اس کا پہلا اعلان یہ ہوتا ہے کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُورًا۔ (۷۶/۹) "ہم تم سے، کسی قسم کے معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں"۔ اور ظاہر ہے کہ تعریف سے بڑھ کر صلہ کونسا ہو سکتا ہے۔

یہ ذہنیت (جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) سربراہِ مملکت ہی کی نہیں تھی۔ اس نظام میں عام کارکنوں میں بھی یہ تبدیلی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔ ایک جنگ میں، دشمن کا ایک سردار اس بے جگری اور جرأت و بسالت سے لڑتا تھا کہ اسے مغلوب کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ مجاہدین کے سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص اس سردار کا سر کاٹ کر لے آئے گا، اسے ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس سردار کا سر سپہ سالار کے خیمے کے باہر پڑا ہے اور کسی کو پتہ نہیں کہ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تو سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جس مردِ حر نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے میں اسے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے۔

یہ سن کر ایک غیر معروف سا سپاہی سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپہ سالار نے پوچھا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے؟ اس نے کہا۔ ہاں! تو سپہ سالار نے کہا کہ یہ لو تمہارا انعام۔

اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے یہ خدمت خدا کے لئے سرانجام دی ہے، انعام کی خاطر نہیں۔ سپہ سالار بہت خوش ہوا۔ اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ وہ بولا ــــ آپ میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں اس کا شہرہ کر دیں۔ تم اس طرح میرا اجر بھی ضائع کر دو گے اور میرے نفس کو بھی خراب کر دو گے۔ مجھے جانے دیجئے۔ (حوالہ ص ۱۲۸)

کامیابی کا راز

یہی وہ حسنِ کردار تھا جس میں مومنین کی اس کامیابی کا راز تھا، جسے (اپنے تو ایک طرف) غیر بھی میر الفقول اور عدیم النظیر قرار دیتے ہیں۔ اسی حقیقت کا حضرت عمرؓ نے، حضرت سعدؓ بن وقاص کے نام ایک گرامی نامہ میں یوں اظہار فرمایا تھا۔

میں تمہیں اور تمہارے لشکریوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں کیونکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار اور سب سے زیادہ کامیاب تدبیر، خوفِ خدا ہے ــــ خوفِ خدا کے معنی ہیں، احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے دشمن کی نسبت، اخلاقی خرابیوں سے زیادہ بچو کیونکہ اہلِ لشکر کی اپنی اخلاقی خرابیاں

ان کے حق میں دشمنوں کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتح صرف اس لئے ہوتا ہے کہ دشمن کے اخلاق ان سے زیادہ پست ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو مسلمان کبھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ نہ ہماری فوج، تعداد میں ان کی فوج کے برابر ہے نہ ساز و سامان میں لہٰذا اگر گنہگاری بھی بداخلاقی اور بدکرداری میں ہم اور وہ ایک سطح پر ہوئے تو پھر وہ کونسی چیز ہوگی جس کے بل بوتے پر ہم ان پر غالب آسکیں گے۔ اگر ہم حسن سیرت میں ان سے آگے ہوں گے تو ہم ان پر فتح حاصل کر سکیں گے تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے اوپر کراماً کاتبین مقرر ہیں جو تمہاری ہر بات کو جانتے ہیں۔ ان سے شرماؤ اور اس طرح ظاہر و باطن ہر بداخلاقی اور معصیت سے بچو) یہ کبھی خیال نہ کرو کہ ہم بُرے ہی سہی، لیکن دشمن ہم سے زیادہ بُرا ہے اس لئے خدا یہ کبھی نہیں کرے گا کہ خواہ ہم برائی ہی کیوں نہ کرتے رہیں، وہ ہم پر مسلّط ہو جائے۔ تاریخ میں دیکھو۔ کتنی قومیں ایسی تھیں کہ ان سے زیادہ بُری قومیں ان پر مسلّط ہو گئیں۔ بابل کا بخت نصر بنی اسرائیل پر کس طرح مسلّط ہو گیا حالانکہ بنی اسرائیل بہرحال خدا کو مانتے تھے اور اہلِ بابل کافر و مشرک تھے۔ (لہٰذا، اپنا اور دشمن کا مقابلہ برائیوں کے پیمانے سے نہیں، اچھائیوں کے پیمانے سے کرو۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے)۔ (صہ ۱۲۸)

معاشی نظام

روٹی کا مسئلہ انسان کی زندگی کا مسئلہ ہے۔ یہ روزِ اوّل سے آج تک اس کے ساتھ لگا چلا آرہا ہے، اور لگا چلا جائے گا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ایک نظامِ معاشرہ وہ ہے جس میں روٹی کا مسئلہ ہی مقصدِ حیات بن کر رہ جاتا ہے، اور ہر شخص کھانے پینے کی پریشانیوں میں سر کھپاتا ہوا دنیا سے چل بستا ہے۔ قرآن کے نزدیک یہ حیوانی سطحِ زندگی ہے۔ اسے وہ کفر سے تعبیر کرتا ہے۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا يَتَمَتَّعُونَ وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۴۷/۱۲)

کفر یہ ہے کہ انسان حیوانات کی طرح، محض کھانے پینے کو مقصودِ حیات قرار دے لے۔ انہی الجھنوں میں اُلجھا رہے۔ اس زندگی کا مآل جہنم ہے۔

دوسرا نظام یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ، کھانے پینے (سامانِ زیست) کی فکر سے آزاد اور فارغ ہوں اور اپنی صلاحیتوں کو ارتقاء اور فروغِ انسانیت کے لئے وقف کر دیں۔ یہ اسلامی نظام ہے اور اس کا مآل جنّت کی زندگی ہے۔۔۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

اسلامی نظام، تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست بہم پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر پر لے لیتا ہے اور ان سے کہہ دیتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲) "ہم تمہاری ضروریاتِ زندگی کے

بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریاتِ زندگی کے بھی"۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اس نظام کی ابتداء عہدِ نبویؐ میں ہوئی تھی لیکن یہ تکمیل تک عہدِ فاروقیؓ میں پہنچا تھا۔ اس کی شہادت آپ کا یہ اعلان بہم پہنچاتا ہے کہ

لو مات کلب علی شاطی الفرات جوعاً۔ لکان عمر مسئولاً عنہ یوم القیٰمۃ (ص ۳۶۹)

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مر گیا، تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔

آپ نے اس ذمہ داری میں، افرادِ معاشرہ کے ساتھ معاشرتی جانوروں کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اس کا انتظام کس طرح کیا گیا تھا، یہ گوشہ ہمارے پیشِ نظر موضوع سے خارج ہے (اس کے متعلق طلوعِ اسلام میں بکثرت لکھا جا چکا ہے، اور پرویز صاحب کی کتاب۔ نظامِ ربوبیت ۔۔۔ میں اس پر تفصیلی بحث کی گئی ہے)۔ سردست ہم یہی بتائیں گے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی اس ذمہ داری کا کس قدر شدید احساس تھا۔

آپ کے زمانے میں مملکت بڑی وسیع ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی (ظاہر ہے کہ) خبر رسانی کا نظام بھی پھیل گیا تھا لیکن لوگوں کی ضروریات پورا کرنے کی ذمہ داری کا احساس اس قدر شدید تھا کہ آپ ذرائع خبر رسانی پر ہی انحصار نہیں کرتے تھے بلکہ (جہاں تک ممکن تھا) خود براہِ راست بھی لوگوں کے حالات معلوم کرتے رہتے تھے۔ اس کے لئے آپ (دن بھر امورِ مملکت کی سرانجام دہی سے عہدہ برآ ہونے کے بعد) راتوں کی تنہائیوں میں گشت بھی کیا کرتے تھے۔ اس گشت کے بہت سے واقعات تاریخ میں مذکور ہیں۔ ہم ان میں سے دو چار کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اترا۔ اس کی خبر گیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگاتے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اُدھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر اُدھر سے گزرے تو بچے کو روتے پایا۔ سخت

بچہ رو رہا تھا

غصّے کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بے رحم ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ روتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! معلوم نہیں تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہو گا۔ اُسی دن منادی کرا دی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ (ص ۱۳۰)

(۲) ایک دفعہ آپ گشت کو نکلے۔ شہر سے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقتِ حال معلوم کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہنڈیا چڑھا رکھی ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم نے امیر المؤمنین کو اس کی اطلاع دی ہے۔ اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں

عام عورتوں تک حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر ہے اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

سوچیئے کہ اس سے عمر فاروقؓ کے دل پر کیا گزری ہو گی! آپ اٹھے۔ بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دے دیجئے۔ میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود ہی اٹھانے دو۔ یہ چیزیں لا کر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیر المؤمنین ہونے کے قابل تم تھے نہ کہ عمرؓ۔ فی الحقیقت امیر المؤمنین ہونے کے قابل یہی تھے۔ (صفحہ ۳۱)

حیرت ہے کہ ایک شخص دن بھر، بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کے جملہ امور سرانجام دیتا اور پھر راتوں کو اس طرح گشت بھی کرتا ہے، تو وہ سوتا کس وقت تھا؟

سونے کی بات آئی تو یہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ مصر کے قاصد، حضرت معاویہؓ بن حدیج ملنے کے لئے آئے تو وہ دانستہ دن ڈھلے ملاقات کے لئے پہنچے۔ آپ کو معلوم ہوا تو کہا کہ تم نے خیال کیا ہو گا کہ دوپہر کے وقت امیر المؤمنین قیلولہ فرما رہے ہوں گے اس لئے تم دیر سے آئے۔ فرمایا۔ معاویہؓ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف، اسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آسکتی۔ (صفحہ ۲۹۷)

اس ضمنی تذکرہ کے بعد، پھر گشت کے واقعات کی طرف آیئے۔

(۴) اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا ——— ویرانے میں ایک خیمہ!

شام کے ویرانے کی بڑھیا

قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ اس نے کہا کہ سنا ہے کہ وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی؟ — آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا، عمرؓ کا کام تھا — آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ عزت سے سننے کے قابل ہے۔ اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے؟ مجھے شام کی بڑھیا نے بتایا۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا کیونکہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمال، ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ، جاؤں گا اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کرکے لوگوں کے حالات براہ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمرؓ نے ایفا نہ کی اور اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔ (ص ۳۰۳)

آپ یہ دورہ تو نہ کر سکے لیکن یہ مستقل حکم نافذ تھا کہ

قلمرو خلافت میں بلا تخصیص مذہب و ملت، ہر تنگدست کی امداد کی جائے۔ ہر مقروض کا قرض ادا کیا جائے۔ ہر کمزور، ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم سے رد کا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے۔ (ص ۲۶۵)

اور اس کی نگرانی خود کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک قاصد (قیس انتجیی) آپ کے پاس آیا۔ اس کا بیان ہے کہ

میں آیا تو آپ لکڑی کی ٹیک لگائے اس طرح کھڑے تھے جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو کھانا کھلوا رہے تھے۔ آپ چکر لگاتے جاتے اور فرماتے جاتے، اے یرفا! اسے گوشت دے۔ اسے روٹی دے۔ اسے شوربا دے۔ (ص ۳۶۵)

اور یہ کچھ خیرات کی طرح نہیں دیا جاتا تھا۔ خیرات کے متعلق تو حضورؐ نے فرمایا ہے کہ: الصدقة تمیت القلب۔ "صدقہ اور خیرات انسان کے دل کی موت ہے"۔ صدقہ اور خیرات کے ذریعے حاجتمندوں کی ضروریات اس زمانے میں پوری کی جاتی تھیں۔ جب ہنوز یہ نظام قائم نہیں ہوا تھا۔ اس وقت اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے بعد تو ارباب اقتدار اسے اپنی ذمہ داری سمجھتے تھے اور صاحب ضرورت مندا سے اپنا حق۔ اس حق کی ادائیگی میں بھی احترام انسانیت کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔

احترام انسانیت

حضرت اسلم کی روایت ہے کہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار گیا تو وہاں ایک نوجوان عورت آپ سے ملی اور کہنے لگی کہ امیر المومنین! میرا شوہر مر گیا اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں۔ میں خفاف بن ایماء الغفاری کی بیٹی ہوں جو حدیبیہ میں رسول اللہؐ کے ساتھ تھے۔ آپ اس کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ گھر آئے اور ایک تنومند و توانا اونٹ پر سامانِ رسد اور دیگر اشیائے ضروریہ لاد کر اس کے پاس لے گئے اور کہا کہ بیٹی! اسے ہنکا لے جا۔ اب تجھے خود آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی تمام ضروری سامان تم تک خود بخود پہنچ جایا کرے گا۔ ایک شخص نے دیکھا تو کہا۔ امیر المومنین! آپ نے اس لڑکی کو بہت زیادہ دے دیا۔ فرمایا کہ تجھے کیا خبر کہ وہ کس باپ کی بیٹی اور کس بھائی کی بہن ہے؟ یہ میں جانتا ہوں۔ (ص ۳۶۶)

ایک دفعہ آپ کسی دعوت میں گئے تو دیکھا کہ اہل خانہ کے ملازم دستر خوان پہ موجود نہیں۔ دریافت

کرنے پر صاحب خانہ نے کہا کہ ہم پہلے کھاتے ہیں۔ وہ بعد میں کھا لیتے ہیں۔ آپ نے اس پر برافروختہ ہو کر فرمایا:۔

خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر آپ نے ان ملازموں کو بلایا۔ پہلے انہیں کھلایا اور بعد میں خود کھایا۔ (ص ۲۶۶)

ایک نہایت اہم فیصلہ

معلوم ہوتا ہے کہ کچھ وقت تک۔ انتظام یہی تھا کہ ملازموں کے کھانے پینے کی ذمہ داری ان کے مالکوں پر تھی۔ لیکن اس میں ایک سقم نظر آیا۔ یہ سقم حاطم ابن ابی بلتعہ کے غلاموں (ملازموں) کے واقعہ میں سامنے آیا جو جرم و سزا کے فلسفہ کے سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہوا یوں کہ ان کے ملازموں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف، چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد

بھوکوں کی چوری

(سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے سخت کام لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

یہ سن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں، تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔ (ص ۲۴۵)

اس فیصلہ سے جرم و سزا کے معاملہ میں بڑے دور رس نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔ یعنی یہ سزائیں اس وقت دی جا سکتی ہیں جب ہر فرد معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی پوری ہو رہی ہوں۔ اس کے لئے آپ نے تمام افرادِ معاشرہ کے وظائف مقرر کر دیئے۔ خوراک ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔ یہ طے کرنے کے لئے کہ فی کس کس قدر خوراک دی جائے، آپ نے (اپنے معمول کے مطابق) عملی طریق اختیار فرمایا۔ آپ نے ایک جریب آٹا پکوا کر لوگوں کو اپنے سامنے کھلایا۔ اس سے تیس آدمی سیر ہو گئے۔ پھر

خوراک کا معیار

اسی طرح شام کو پکوا کر کھلایا۔ اور جب اطمینان کر لیا کہ اتنا آٹا کافی ہوتا ہے تو اس کے مطابق ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا۔ اسی کے مطابق آپ نے اپنے عمال کو بھی ہدایات بھیجیں۔ اور اس کے ساتھ ہی تاکید کر دی کہ "لوگوں کی خوراک ان کے گھروں پر پہنچاؤ۔ اور اتنا دو جس سے ان کا اور ان کے بچوں کا خوب گزارہ ہو جائے۔ یاد رکھو! مٹھی مٹھی دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں ہو سکتے ــــ اخلاق کا معاش سے کس قدر گہرا تعلق ہے، اس کا اندازہ

حضرت عمرؓ کی ہدایات کے آخری الفاظ سے لگ سکتا ہے۔ (ص ۳۹۸)

اور جب یہ تمام انتظامات اطمینان بخش طریق سے مکمل ہو گئے تو

آپ نے مال جمع کرنے سے روک دیا اور مسلمانوں پر اراضی بطور جاگیردار رکھنا اور اپنے طور پر کاشتکاری کرنا یا کرانا حرام قرار دے دیا۔ کیونکہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے معاش کا بندوبست بیت المال سے کر دیا گیا تھا۔

(جوہری طنطاوی۔ بحوالہ نظام العالم و الامم۔ جلد دوم۔ شاہکارِ رسالت ص ۳۹۹)

اس طرح خدا کے ان احکام کی تعمیل ہو گئی کہ مال و دولت جمع کرنا اور زمین پر ذاتی ملکیت رکھنا جائز نہیں۔

---(۰)---

حسبنا کتاب اللہ

سوال یہ ہے کہ اس قدر عظیم انقلاب جس کی نظیر آسمان کی آنکھ نے نہیں دیکھی تھی اور افرادِ معاشرہ کی سیرت و کردار میں ایسی محیر العقول تبدیلی رونما کیسے ہو گئی؟ اس کا جواب حضرت عمرؓ کے ان دو الفاظ میں آجاتا ہے جو انہوں نے نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں اس وقت ارشاد فرمائے تھے جب عام احساس یہ تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد کیا ہوگا۔ ہمیں کہاں سے راہ نمائی ملے گی۔ آپ نے فرمایا تھا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔

حسبنا کتاب اللہ!

خدا کی کتاب ہمارے لئے کافی ہے۔ (ص ۶۵)

یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی صدائے بازگشت تھی جس میں فرمایا گیا تھا کہ

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ..... (۲۹/۵۱)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

اور حضورؐ کے اس ارشادِ گرامی کی تعبیر جسے آپؐ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں، ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع میں بدیں الفاظ ارشاد فرمایا تھا کہ

وقد ترکت فیکم ما لن تضلوا بعدہٗ ان اعتصمتم بہٖ کتاب اللہ۔

(بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم میرے بعد اس کے ساتھ متمسک رہے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ (ص ۶۵)

حضرت عمرؓ اس کتاب کے ساتھ خود بھی متمسک رہے اور قوم کو بھی اسی کے مطابق چلایا۔ آپ ہمیشہ دعا کیا کرتے تھے کہ

یا اللہ! مجھے تفکّر و تدبّرِ قرآنی عطا فرما، تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں۔ اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔ (ص ۶۶)

اور اپنے رفقاء سے کہا کرتے تھے کہ

قرآن پڑھا کرو، اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی۔ اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم، حاملِ قرآن بن جاؤ۔ (ص ۶۶)

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میری بات مانو۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ تم مجھے اس کے مطابق مشورہ دو۔ (ص ۶۶) وہ قرآن میں تفقہ (غور و فکر) پر بہت زور دیتے تھے چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ زمانہ قریب آ رہا ہے جب قرآن کے قاری تو بہت ہوں گے لیکن اس پر غور و فکر کرنے والے بہت کم ہوں گے۔" (ص ۶۷) وہ عمال کے انتخاب میں اس خصوصیت پر بڑا زور دیتے تھے کہ ان کی قرآن پر گہری نگاہ ہو۔ (ص ۲۸۴) معاملات کے فیصلہ کرنے میں وہ سند قرآنِ کریم کو قرار دیتے تھے نہ کہ اپنی رائے کو۔

آپ نے ایک دفعہ کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ یہ "اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔" اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کے لئے سنّت نہ بناؤ۔" اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدّت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ ــــ جس پر میں نے دادا کے حصّہ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔" اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام، آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جبتک وہ ہڈی نہ آ گئی۔ اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا ــــ احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔ (ص ۲۷۵)

وصیّت

قرآنِ کریم کی اہمیت و عظمت آپ کے رگ و پے میں اس شدّت سے سرایت کئے ہوئے تھی کہ

جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقع ہو گئی تھی کیفیت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آ چکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے۔ تو آپ نے ان سے کہا کہ

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تم اسے تھامے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بے قرار ہیں۔ اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس میں متردد نہ ہوں جہنم کی آگ آپ کے جسم کو مس تک نہ کر سکے گی۔ آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ اور کہا کہ بھائی تمہارا علم اس معاملہ میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف پر نچھاور کر دیتا۔ آپ نے یہ آخری الفاظ کہے تو حضرت ابنِ عباسؓ نے، جو پاس بیٹھے تھے کہا کہ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حصے برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابن عباسؓ! کیا تم میرے لئے خدا کے ہاں اس کی شہادت دو گے؟ وہ خاموش ہو گئے تو آپ نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا اور دوبارہ کہا کہو! ابن عباسؓ! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔ (صفحہ ۲۱۳-۲۱۴)

لیکن ان شہادات کے باوجود آپ پر اپنی ذمہ داریوں کے محاسبہ کا احساس شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمرؓ ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہو گا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہو گی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔ (صفحہ ۲۲۳)

کسی کمزور پر ظلم کرنے سے ساری عمر کی نیکیاں رائیگاں چلی جائیں گی! یہ تھا وہ ایمان جس نے ابنِ خطابؓ کو فاروقِ اعظمؓ بنا دیا تھا۔

———(۰)———

قانون سازی

سابقہ صفحات میں ہم نے "فاروقیت" کی پاکیزگی سیرت اور بلندی کردار

تک محدود رکھا ہے، کہ اس کے بغیر نہ معاشرہ میں کوئی اصلاح ہو سکتی ہے، نہ ہی اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ اس کے بغیر اصلاحِ احوال کی کوشش خدا کو چیلنج دینے کے مترادف ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ ..... (۱۳/۱۱)

تم تو ایک طرف رہے خود خدا بھی کسی قوم کے حالات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک وہ قوم خود اپنے اندر (نفسیاتی) تبدیلی پیدا نہ کر لے

لہٰذا، تغیرِ نفس (سیرت و کردار) کی تبدیلی کے بغیر اصلاحِ معاشرہ کی کوشش کے یہ معنی ہیں کہ ہم (معاذ اللہ) خدا سے یہ کہتے ہیں کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ تغیرِ نفس سے بغیر، تغیرِ احوال ناممکن ہے۔ ہم ایسا کر کے دکھا دیں گے! اس کا جو نتیجہ ہوگا ظاہر ہے۔ یہ وجہ ہے جو "فاروقیت" (اور اس اعتبار سے رسالتؐ اور صدیقیتؓ میں بھی) قدم اوّل، قوم کی ذہنیت میں تبدیلی تھی۔ قرآنِ کریم نے جو اعمالِ صالحہ کو ایمان کے ساتھ مشروط رکھا ہے تو اس کا بھی یہی مطلب ہے۔ ایمان تبدیلیٔ ذہنیت کا نام ہے۔ اس کے بغیر اعمالِ صالحہ کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔

لیکن پاکستان میں اقلیت، قانون سازی کو دی گئی ہے اور اس میں بھی کیفیت یہ ہے کہ ——— ڈور کو سلجھا رہے ہیں، اور سرا ملتا نہیں۔ قانون سازی کی مہم، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ہے، جو ایک ہی جگہ چکر کاٹ رہی ہے اور ایک قدم بھی جانبِ ساحل نہیں بڑھتی۔ اس کی وجہ بھی یہ ہے کہ ہم نے "فاروقیت" کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

قرآنِ کریم نے کچھ اصول و اقدار دیئے ہیں جو ابدی اور غیر متبدّل ہیں۔ یہ اصول و اقدار، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی اُمّت باہمی مشاورت سے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، جزئی قوانین خود وضع کرتی ہے، جنہیں احکامِ شریعت کہا جاتا ہے۔ قرآنی حدود اپنی جگہ محکم اور غیر متبدّل رہیں گی لیکن ان کے اندر وضع کردہ جزئی قوانین ضرورت کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (ص ۲۷۱)

جب آپ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گذرے ہوئے (بس یہی) تین چار سال کا عرصہ ہوا تھا۔ لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا اس لئے حالات میں کافی تبدیلیاں آگئی تھیں۔ چنانچہ آپ کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ سامنے آتا تو آپ سابقہ ادوار (عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدّیقیؓ) کو دیکھتے۔ اگر کوئی ایسا فیصلہ مل جاتا جو جدید تقاضوں کو بھی پورا کر دیتا تو آپ اسے نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی

تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے۔ اور عندالضرورت جدید فیصلہ نافذ کر دیتے۔ لیکن یہ سب کچھ اُمت کے مشورہ سے ہوتا۔ اس مجلس مشاورت میں معمر اور پختہ کار صحابہؓ شامل تھے، لیکن آپ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے۔ حتیٰ کہ عورتوں سے بھی (صفحہ ۲۷۲)

آپ مشاورت کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور اس میں کس حد تک آزادیٔ رائے ملحوظ رکھی جاتی تھی، اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے جس کی تاریخ نے بڑی تفصیلات اپنے دامن میں سمیٹ رکھی ہیں۔ قرآن کے معاشی نظام کی رو سے زمین مملکت کی تحویل میں رہتی ہے۔ ذاتی ملکیت میں نہیں۔ لیکن یہ نظام اپنی انتہائی شکل تک بتدریج پہنچتا ہے۔ رسول اللہؐ نے اس نظام کے ابتدائی دور میں، مختلف قطعاتِ اراضی کو انفرادی تحویل میں تو رہنے دیا تھا لیکن مزارعت (بٹائی یا کرایہ پر کاشت کرانے) کو ربوٰ قرار دے کر اسے ممنوع ٹھہرا دیا تھا۔ یہ مسئلہ مملکتی سطح پر عہدِ فاروقی میں زیرِ بحث آیا جب عراق کی وسیع و عریض زمینیں اسلامی مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ اس پر جس گرم جوشی سے (مخالف اور موافق) بحثیں ہوئیں وہ تاریخ میں مذکور ہیں۔ اس باب میں سربراہِ مملکت نے اعلان کر دیا تھا کہ

> میں نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں اور آپ جسے حق سمجھتے ہیں، اسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ ایک بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ خدا کی کتاب جس طرح میرے پاس ہے اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے یہی ناطق الحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہے۔ (صفحہ ۲۸۵)

چنانچہ کئی دنوں کی بحث و تمحیص کے بعد، فیصلہ اس آیۂ قرآنی کے مطابق ہوا جسے حضرت عمرؓ نے اس اصول کی تائید میں پیش کیا کہ زمین انفرادی ملکیت میں نہیں بلکہ مملکت کی تحویل میں رہنی چاہیئے تاکہ مملکت افرادِ معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برا ہو سکے۔ (صفحہ ۲۸۶)

یہ تھا قوانین سازی کے سلسلہ میں "فاروقیت" کا طریق کار، جس میں ابدی اور غیر متبدل حرف قرآن کریم کے احکام و اصول رہتے ہیں۔ باقی فیصلے قابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے سابقہ ادوار کے کئی فیصلوں میں تبدیلی کی اور کئی نئے فیصلے صادر فرمائے۔ (انہیں اولیاتِ عمرؓ کہا جاتا ہے)۔

یہ ہیں اس "فاروقیت" کی چند جھلکیاں جسے اپنائے بغیر (بقول صدرِ مملکت) نہ معاشرہ کی اصلاح ہو سکتی ہے، نہ قانون سازی کی کوئی کوشش کامیاب۔

(۰)

ارشادات

(حضرت عمرؓ کے اقوال جو اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں)۔

۱۔ خلافت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے حساب، دیتے وقت بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور

کسے دیا تھا۔ اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو خلافت، ورنہ ملوکیت ۔۔

۲۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔

۳۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو کہ خدا کی مخلوق تمہیں کیا سمجھتی ہے۔

۴۔ کسی قوم سے مقابلہ کے وقت، یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں تمہاری خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں۔ یہ ہے کامیابی کا راز۔

۵۔ حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

۶۔ ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہیئے۔

۷۔ ایک اور گورنر کو لکھا کہ ایسے رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف ہو اور بدقماش خوف زدہ۔

۸۔ عمالِ حکومت کے سلسلہ میں کہا کہ طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔

۹۔ وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔

۱۰۔ جو شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں مغلوب ہے جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا وہ کامیاب نہیں ناکام ہے۔

۱۱۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

۱۲۔ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔

۱۳۔ جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں وہ قصرِ سعد نہیں، محلِ فساد ہے۔

۱۴۔ کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اُسے غصہ کی حالت میں نہ آزما لو۔

۱۵۔ ایک شخص نے کہا کہ مؤمن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ: فقرہ پورا کرو اور یوں کہو کہ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔

۱۶۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچوں کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آجائے تو مرد بن جائے۔

۱۷۔ ازدواجی زندگی میں مثالی معیار (IDEALISM) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۱۸۔ جوانوں سے کہا کہ جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہِ ندامت نہ ہو۔

۱۹۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو میٹھی میٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔

۲۰۔ جس نے اپنی مدد کے لئے کسی خاندان یا برادری کا نام لے کر آواز دی سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد خاندانوں، قبیلوں اور برادریوں کی تفریقات ختم ہو جاتی ہیں۔

۲۱۔ اللہ تعالےٰ حالات اور زمانے کے تقاضوں سے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲۲۔ عمرؓ کی رائے اور وحیٔ خداوندی میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھو۔ عمرؓ کی رائے ایک انسان کی رائے ہے، جو غلط بھی ہو سکتی ہے، اسے سند اور سنت نہ بناؤ۔

۲۳۔ کسی بات کے جواب میں واللہ اعلم بالصواب مت کہو جو بات نہیں جانتے اس کے متعلق سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ

محشرستانِ فلسطین

(نوشتہ ۱۹۶۷ء)

(قسط ۲)

اعلان بالفور

برطانیہ کو چونکہ جنگ میں عربوں کی امداد کی ضرورت تھی، اس لئے اس نے ان سے رنگا رنگ وعدے کئے۔ برطانیہ کو اسی طرح یہودیوں کی امداد کی بھی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے عربوں کی طرح یہودیوں سے مبالغہ آمیز اور غیر دیانتدارانہ وعدے کئے۔ پہلی عالمگیر جنگ میں، کہ جس کے سیاسی پس منظر کے ایک پہلو کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، جرمنی کی للچائی ہوئی نظریں مشرقِ وسطیٰ پر تھیں۔ وہ یہودیوں کی امداد حاصل کرنے کے لئے موہوم وعدے کر سکتا تھا۔ انگریز نے جرمنی کے وعدوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے اس پر سبقت لے جانا چاہی۔ چنانچہ یہودیوں کو بھی عربوں کی طرح سبز باغ دکھائے گئے۔ ان متضاد وعدوں کی دوسری وجہ یہ تھی کہ امریکہ میں یہودیوں کا بے پناہ اثر تھا۔ وہ نہ محض امریکی پریس پر ہی چھائے ہوئے تھے بلکہ حکومت کی پالیسی ان کے ہاتھ میں تھی۔ برطانیہ، امریکہ کو اپنی طرف سے جنگ میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ امریکہ کے بغیر جنگ کے لئے نہ مطلوبہ سرمایہ فراہم ہو سکتا تھا، نہ مطلوبہ بارود اور اسلحہ۔ امریکہ کو شریکِ جنگ کرنے کا ایک ذریعہ یہودی تھے۔ تیسری وجہ ڈاکٹر وائزمین، صدر ذائنسٹ ایسوسی ایشن نے مہیا کی۔ کیمیادان وائزمین نے کیمیائی جنگ کے سلسلہ میں کوئی اہم انکشاف کیا جسے اس نے برطانیہ کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ اس احسان کا بدلہ ضرور دینا چاہتا تھا اور وائزمین نے ذاتی انعام سے انکار کر دیا تھا۔ ان سب الجھنوں کا حل اعلانِ بالفور ہے جو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو شائع ہوا۔ اس میں مرقوم تھا۔

> ملکِ معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی وطن کے قیام کو بنظرِ استحسان دیکھتی ہے اور امکانی کوشش کرے گی کہ اس کا حصول آسان ہو جائے۔ یہ واضح رہے کہ ایسا کوئی اقدام نہیں کیا جائے گا جس کی زد فلسطین میں موجودہ غیر یہودی فرقوں کے شہری اور مذہبی حقوق پر پڑے یا یہودیوں کے اس سیاسی مرتبہ اور حقوق پر جو انہیں دیگر ممالک میں حاصل ہیں۔

اعلانِ بالفور ایک اہم سرکاری دستاویز ہے کہ جس کی رُو سے یہودیوں اور عربوں کی تقدیر کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس عجیب و غریب دستاویز میں کہیں عربوں کا ذکر نہیں۔ فلسطین کی آبادی میں اختتامِ جنگ پر نوّے فی صدی عرب تھے اور صرف دس فی صدی یہودی۔ لیکن اس بدقسمت ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ذکر ہوتا ہے تو یہودیوں کا اور غیر یہودی فرقوں کا۔ گویا فلسطین میں بیشتر یہودی آباد تھے اور عرب اقلیت تھے۔ ایسی اقلیت کہ اسے "غیر یہودی" فرقہ، کی غیر واضح اور مبہم اصطلاح سے ہی یاد کیا جا سکتا تھا۔ اس سارے اعلان میں 'عرب' کا لفظ تک نہیں۔ اور مدبرین و سیاستدان عربوں کی قسمت کا فیصلہ چکا رہے تھے۔ فلسطین کے اوّلین باشندے کون تھے؟ یہ کوئی بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ یقینی ہے کہ عرب (مسلمان) تیرہ سو سال سے اس ملک پر قابض و متمکن چلے آ رہے تھے۔ یہودی دو ہزار سال سے اس ملک سے بے دخل تھے۔ اور اس دو ہزار سال میں ان کی زیادہ سے زیادہ آبادی دس فی صدی ہو سکی تھی۔ کیا دو ہزار سالہ تاریخ کا نوشتہ مٹایا جا سکتا ہے؟ کیا اتنے طویل سفر سے رجعت ممکن ہے؟ کیا انگریز یا کوئی طاقت تاریخ کے فیصلے کو الٹ سکتی ہے؟ کیا یہودیوں کو فلسطین اس لئے دیا جا سکتا ہے کہ وہ کوئی دو ہزار سال پیشتر اس میں آباد تھے؟ اس کے بعد وہ بھیڑ بکریوں کی طرح وہاں سے بکھیر دیئے گئے اور پھر کبھی اتنی قوت بھی مجتمع نہ کر سکے کہ اس مقدس ملک پر تسلط جما سکیں؟ کیا اب انگریزوں کو محض اس لئے جرمنی کا ملک دیا جا سکتا ہے کہ ان کے آباؤ اجداد کبھی جرمنی میں آباد تھے؟ یا انگلستان جرمنی کو بدیں وجہ بخشا جا سکتا ہے کہ اسے کبھی جرمن اسلاف نے فتح کیا تھا؟

یہودی وطن نہ کہ یہودی حکومت

بہرکیف اعلانِ بالفور نے "قومی وطن" کا وعدہ کیا، نہ کہ قومی حکومت کا۔ لیکن اس کے بعد کی ساری سیاست اسی نقطہ کے گرد گھوم رہی ہے کہ فلسطین یا اس کے کسی حصّہ میں یہودی حکومت قائم ہو جائے۔ "قومی وطن" ایک بالکل نئی اصطلاح تھی، لہٰذا دیانت کا تقاضا تھا کہ اس کے معانی متعیّن کر دیئے جاتے تاکہ فریقین غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے۔ اس سے پہلے کبھی بھی یہ مضحکہ خیز تصوّر پیش نہیں ہوا تھا کہ کسی ایک قوم کو کسی اور قوم کے ملک میں قومی وطن دے دیا جائے۔ اس اصطلاح کو قصداً مبہم رکھا گیا تاکہ جانبین کو اس حسین مغالطہ میں رکھا جائے کہ ان کے حقوق محفوظ ہو گئے ہیں۔ اس کے معانی یہودیوں نے کیا سمجھے؟ اس کا اندازہ وائزمین کے ایک اعلان سے ہوتا ہے جس میں اس نے کہا کہ اب فلسطین ایسی ہی یہودی مملکت بن جائے گی جیسی کہ انگلستان انگریزوں کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بالفور نے زبانی اس مجذوب کی بڑ کی تائید بھی کی تھی۔ لیکن کیا آئین و قانون میں زبانی وعدے کوئی حقیقت رکھتے ہیں؟ بالخصوص ایسے وعدے جنہیں ضبطِ تحریر میں لانے سے خاص طور پر گریز کیا جائے؟ وہ استغاثہ کی بنیاد نہیں بن سکتے نہ فیصلہ کی اساس ہو سکتے ہیں۔ کیا ایسے زبانی وعدے کسی ملک پر اس کی منشاء و رضامندی کے خلاف مسلّط کئے جا سکتے ہیں؟

شاہ فیصل نے اعلانِ مذکورہ کو غیر مشروط تسلیم نہیں کیا بلکہ اس سے متعلق معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے تحریر کیا:-

> بشرطیکہ عرب اپنی آزادی حاصل کر لیں ...... لیکن اگر معمولی کمی بیشی بھی ہو گئی تو میں اس اعلان کے ایک لفظ کو بھی نہیں مانوں گا۔ اور یہ اعلان ساقط العمل، بیکار اور ناجائز ہو جائے گا۔ اور میں کسی طرح بھی کسی قسم کا جواب دہ نہیں رہونگا۔

یہ غیر مبہم تحریر ہے اور اس کے صرف ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ اعلانِ بالفور عربوں کی آزادی میں منتج ہو تو قابلِ عمل ورنہ بیکار، ناجائز، ساقط العمل! اس اعلان نے یقیناً عربوں کو آزادی نہیں دلائی بلکہ انہیں اور پابندِ سلاسل کر دیا ـــــ لہٰذا عرب اس کا ایک لفظ بھی ماننے پر مکلف نہیں ـــ لہٰذا اعلان ساقط العمل! اب اسے اساسِ مذاکرات بنانا لیعنی چہ!! اس کے بعد معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب میں دے دیا گیا جس کی اساس اعلان بالفور پر استوار تھی۔

برطانوی وعدے

یہ ظاہر ہے کہ جنگ کے دوران میں ان کی امداد و تائید حاصل کرنے کے لئے برطانیہ نے عربوں سے بھی وعدے کئے اور یہودیوں سے بھی۔ یعنی پہلے عربوں سے اور پھر یہودیوں سے۔ یہ وعدے یا تو ایک دوسرے کی ضد ہیں یا باہمی طور پر مطابق۔ اگر متضاد ہیں تو اخلاقاً اور قانوناً وہ وعدے قابلِ قبول و عمل ہیں جو پہلے کئے گئے۔ کیونکہ ایک قانونی ضمانت دے دینے کے بعد انگریز اس سے متضاد وعدہ کسی اور فریق سے نہیں کر سکتے تھے لہٰذا برطانیہ کے وہ وعدے جو یہودیوں سے کئے گئے اور عربوں سے کئے گئے، وعدوں کی ضد ہیں، غیر قانونی اور قابلِ استرداد ہیں۔ اگر وہ وعدے ایک دوسرے کے مطابق ہیں تو اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ عرب اپنی آزاد حکومت قائم کر سکتے ہیں اور انگریزوں کا ہرگز یہ منشا نہیں تھا کہ کسی عرب ملک میں کسی غیر عرب (یہودی) کی سلطنت قائم کریں یا اسے بزورِ شمشیر مسلط کریں۔ اس سے فیصلہ انتداب بھی غلط ہو جاتا ہے اور فیصلہ تقسیم بھی۔ اگر تینوں فریقوں یعنی برطانیہ، عربوں اور یہودیوں میں سے کوئی ان وعدوں کا مفہوم کچھ اور لیتا ہے تو اس کے حل کی بہترین صورت یہ ہے یا تھی کہ تحریری دستاویزات کو، کہ وہی وجہ نزاع ہیں، بین الاقوامی عدالت میں برائے فیصلہ پیش کیا جاتا۔ برطانیہ نے ایسا کرنے کی بجائے معاملہ جمعیۃ اقوامِ متحدہ کے سپرد کیا جس نے عربوں کی مرضی کے خلاف برطانوی وعدوں کو ٹھکراتے ہوئے فلسطین (اور بعض دیگر عربی ممالک) کو انتداب کی لعنت میں گرفتار کر دیا جمعیۃ اقوام ایسا کرنے کی مجاز نہیں تھی۔ معاہدۂ امن کی خبر پا کر عربوں نے جولائی ۱۹۱۹ء میں دمشق میں ایک مؤتمر طلب کی۔ اس مؤتمر کی قراردادوں میں ہے:۔

> ہم جنوبی شام میں جس کو فلسطین کہا جاتا ہے، یہودیوں کے اس مطالبہ کو رد کرتے ہیں کہ وہاں یہودی دولتِ مشترکہ (JEWISH COMMON WEALTH) قائم ہونی چاہیئے۔ ہم یہودیوں کے داخلہ فلسطین کے ہی مخالف ہیں۔ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان

> کا ایسا حق ہے اور ہم ان کے مطالبات کو اپنی قومی، سیاسی اور معاشی زندگی کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہمارے (موجودہ) یہودی شہری ہماری طرح ملکی حقوق و فرائض میں بدستور شریک رہیں گے۔

ممالکِ عربیہ میں عام جذباتِ نفرت پھیل گئے۔ ان کا خون، ان کی قربانیاں سب اکارت گئی تھیں۔ عربی حمیت، قومی خودداری کی یہ تذلیل کب دیکھ سکتی تھی؟ انہوں نے بچے ذبح کرائے، جوان قربان کیئے، مصیبتیں جھیلیں، ملک برباد کرائے، اس امید پر کہ وہ آزادی سے ہمکنار ہو سکیں گے۔ لیکن اس سرفروشی اور ایثار پیشگی سے ملا تو کیا؟ —— غلامی، لعنت و ذلّت!!

فیصل نے تنگ آ کر ایک کمیشن کا مطالبہ کیا جو جملہ امور کی تحقیقات کرے۔ برطانیہ اور فرانس کو اپنی شیطنت کاریوں اور ریشہ دوانیوں کا علم تھا۔ انہوں نے اس منصفانہ مطالبے کو تسلیم نہیں کیا۔ البتہ امریکہ نے کہ اس وقت تک غیر جانبدار تھا، اس کا خیر مقدم کیا۔ نتیجہ کنگ، کرین رپورٹ کی صورت میں نکلا۔ یہ رپورٹ اس لئے قابلِ ذکر ہے کہ غیر جانبدار اشخاص کی مرتب کردہ ہے۔ اس رپورٹ میں متشدد صیہونیوں کی مذمت کی گئی جو غیر محدود داخلہ فلسطین پر مصر ہیں۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ قومی وطن قومی حکومت نہیں۔ ایسا کرنا "غیر یہودی فرقوں" کے مدنی اور مذہبی حقوق کو پامال کیئے بغیر ناممکن ہے۔ واضعین رپورٹ نے تسلیم کیا کہ وہ ابتداءً یہودیوں کے حامی تھے۔ اس کے باوجود حقائق و واقعات کا مطالعہ کر کے انہوں نے مؤتمرِ امن کو مشورہ دیا۔

> یہودیوں کا داخلہ فلسطین یقینی طور پر محدود ہونا چاہیئے اور فلسطین کو یہودی دولتِ مشترکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دینا چاہیئے۔

خلافِ صیہونیت تحریک

۱۹۱۹ء کے بعد حالات کی رفتار بدل گئی کیونکہ ہمہ گیر خلافِ صیہونیت تحریک پھیل گئی جس سے یہودی کثیر تعداد میں سابقہ وطن ترک کر کر کے فلسطین میں آنا شروع ہو گئے۔ ان تارکینِ وطن یہودیوں کو اپنے حال پر رہنے دیا جاتا تو ان میں سے اکثر یقیناً فلسطین کا رُخ نہ کرتے۔ فلسطین یہودی بے وطنی اور غربت کا حل نہیں۔ لیکن صیہونی سوسائٹیوں نے اس مصیبت کا فائدہ اٹھایا اور اس سیلاب کو فلسطین کی جانب پھیر دیا۔ ۱۹۳۲ء میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا۔ ہٹلر پہلی عالمگیر جنگ میں جرمنی کی شکست کا ذمہ دار بہت حد تک یہودی سازشوں کو قرار دیتا تھا۔ لہٰذا آئندہ تیاری سے بیشتر وہ اپنے ملک کو ان غداروں سے پاک کر دینا چاہتا تھا۔ ہٹلر کی فتوحات کے ساتھ ساتھ خلافِ صیہونیت تحریک یورپ میں بھی پھیل گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں فلسطین کی یہودی آبادی ۳۰ فی صدی تک پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی تعداد پچاس ہزار سے پانچ لاکھ اناسی ہزار ہو گئی۔ عرب قدرتی طور پر متوحش ہوئے۔ انہیں ڈر ہوا کہ اگر فلسطین کے دروازے بدستور کھلے رہے تو یہودی ایک دن اکثریت میں آ جائیں گے اور ان کا ملک یہودی مملکت ہو جائے گا۔ یہودیوں نے سرمایہ کے زور سے غریب عربوں کی

زمینیں خریدنا شروع کر دی تھیں۔ وہ اپنی علیحدہ آبادیاں اور بسا رہے تھے۔ ان کی آمد سے عرب بے دخل اور اقتصادی طور پر یہودیوں کے زیر اثر ہوتے جا رہے تھے۔ یہودیوں کی پشت پر وہ یہودی سرمایہ دار تھے جو افسانوی دولت کے مالک تھے۔ صیہونیت ایک منظم تحریک تھی۔ اس کے مقابلہ میں عرب غیر منظم اور مفلس تھے۔ لہٰذا ان کے خدشات قدرتی اور حقیقی تھے۔

کہا جاتا ہے کہ چونکہ یہودی مظلوم ہیں اور انہیں آبائی گھروں سے نکالا گیا ہے اس لئے انہیں فلسطین میں آباد ہونے دیا جائے۔ یہ دلیل دینے والے یہ نظر انداز کر جاتے ہیں کہ عرب خود سامی النسل ہیں۔ لہٰذا یہ ناممکن ہے کہ وہ بھی نام نہاد "اینٹی سامی" تحریک کے علمبردار بن جائیں۔ ہٹلر نے یہودیوں پر جو مظالم کئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خود آریائی نسل سے تھا اور سامیوں کا دشمن تھا۔ یہودی مظلومین کے نام نہاد ہمدردوں اور بہی خواہوں نے جس انداز سے یہودیوں کو فلسطین پر مسلط کیا ہے اس سے "سامی دشمنی" کا دائرہ وسیع ہو گیا ہے۔ عرب کبھی "سامیوں" (یہودیوں) کے دشمن نہیں تھے۔ وہ اب بھی نہیں۔ انہوں نے بارہا اعلان کیا ہے کہ عرب ممالک میں بسنے والے یہودیوں کو پورے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ ان پر یہودی ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی پابندی نہیں ہوگی۔ فلسطین میں موجود یہودیوں سے اب بھی وہ فراخدلانہ، برادرانہ سلوک کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن جن یہودیوں نے عربوں کے وطن کو خون و آتش کی بازی گاہ بنایا ہے، جن کے ہاتھوں عربوں کے مال و دولت کو نقصان پہنچا، ان کی جانیں ضائع ہوئیں، انہیں عرب کیسے برداشت کر سکتے ہیں؟ ہمدردان یہود نے یہودیوں کو "سامی دشمنی" کے یورپی حلقے سے نکال کر عربی حلقے میں جھونک دیا ہے۔ یورپ میں جو آگ خاموش ہو گئی تھی، اسے محبانِ اسرائیل نے عرب میں روشن کر لیا ہے۔ اب یہودی اپنے ہاتھوں جلائی ہوئی اسی آگ میں جل رہے ہیں۔

انتدابِ فلسطین

انتدابِ فلسطین "اے کلاس" تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ فلسطین کی آزادی تسلیم کر لی گئی ہے لیکن جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا، اسے نگرانی میں رکھا جائے گا۔ انگریز کی یہود نوازی عرب آزادی کی منزل کو دور سے دور تر کرتی جا رہی ہے۔ اس کی کیا ضمانت تھی کہ یہ سلسلہ اس وقت رکے گا جب فلسطین یہودی بن چکا ہوگا۔ ان کے ہوتے ہوئے کیا اعراب فلسطین آزاد ہو سکیں گے۔ ۱۹۲۷ء میں برطانیہ نے سیلف گورنمنٹ کی طرح ڈالنی چاہی۔ ایک نمائندہ اسمبلی کی تجویز ہوئی جو ہائی کمشنر کی مشاورتی مجلس ہوتی۔ یہودی ہر چند اقلیت میں تھے لیکن ان کے نمائندے برطانوی پارلیمان میں بھی تھے اور برطانوی حکومت میں بھی۔ یہ حقیر سی کوشش بھی یہودی مخالفت کی نذر ہو گئی۔ انگریز نے بیانگِ دہل اسمبلی کے قیام کا اعلان کیا تھا لیکن اس نے اچانک اسے ترک کر دیا۔ عرب کب تک ضبط کرتے، معاملات دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ۱۹۳۶ء میں فلسطین بھر میں احتجاجی مظاہرے شروع ہو گئے۔ برطانیہ نے تشدد سے اس آزادی کی رَو کو دبانا چاہا۔ عربوں کے ہیجان کی

حقیقی وجوہات تھیں، اس لئے حکومت کا جبر و تشدد اسے کچل نہیں سکتا تھا۔ برطانیہ نے پہلو بدلا اور رائل کمیشن قائم کر دیا۔ کمیشن کی تحقیقات کا ماحصل یہ تھا کہ انتداب ناقابلِ عمل ہے۔ کمیشن نے یہ اضطراری حل پیش کیا کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے اور یہود اور عربوں کو علیحدہ علیحدہ حصے عطا کر دیئے جائیں۔

انتداب کا مقصد فلسطین کو آزادی کے لئے تیار کرنا تھا مگر برطانیہ نے فلسطین کو آزادی کے بجائے تقسیم کے لئے تیار کیا۔ یہ تقسیم کی پہلی تجویز تھی۔ فلسطین کی تقسیم! پنجاب کے بمشکل چار اور سندھ کے کوئی دو اضلاع کے برابر ملک کی تقسیم!!! اور تقسیم کیوں؟ اس لئے کہ یہود کے لئے عرب ملک میں قومی وطن قائم ہو سکے! ابتدا قومی وطن سے ہو گی اور انتہا قومی حکومت پر۔ آخر ان حرکاتِ مذبوحی سے حاصل؟ فلسطین کی مجموعی آبادی بیس لاکھ ہے اور اس کا رقبہ دس ہزار مربع میل۔ کوئی پانچ ہزار مربع میل کا علاقہ غیر ذی زرع صحرائی ہے۔ اگر یہ سارا علاقہ آبادی کے قابل ہو سکے تو فلسطین کی آبادی دوگنی یعنی چالیس لاکھ ——— یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ ہو جائے گی۔ یہ سارے کا سارا قطعہ زمین بھی یہودیوں کے لئے ناکافی ہے۔ دنیا بھر میں یہودی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہے۔ اتنا حجم بقیناً اس مختصر سے قطعہ ارض میں نہیں سما سکتا۔ یعنی اگر سارے کا سارا فلسطین یوں یہودیوں کو دے دیا جائے کہ اس میں ایک عرب بھی باقی نہ رہے تو بھی یہودی اس میں نہیں سما سکتے۔ اور جب ایسا ہے کہ ان کی مشکل کا حل فلسطین نہیں ہو سکتا تو سارا زور صرف فلسطین پر صرف کرنے سے فائدہ؟ کیا یہودی ہمدردی کے بہانہ سے عربوں کو کچلا نہیں جا رہا؟ اور پھر اگر بالفرض یہودی سما بھی جائیں تو برطانیہ اور امریکہ ایسا کرنے یا کرانے والے کون؟ انہیں کس آئین یا کس قانون نے یہ حق دیا ہے؟ اگر وہ ایسے ہی انسانیت نواز اور بنی نوع انسان کے ہمدرد ہیں تو ان کا ادعائے ہمدردی انسان اس وقت کس غار میں جا چھپا تھا جب مشرقی پنجاب، دہلی، مغربی یوپی اور کشمیر کے لاکھوں اور نہتے مسلمانوں کو تہ تیغ کیا جا رہا تھا؟ اس تاریخ میں فقید المثال قتلِ عام کی زد اتنے انسانوں پر پڑی جو مجموعی طور پر یہودیوں کی دنیا بھر کی آبادی سے بھی زیادہ ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ نے نہایت تحمل اور خاموشی سے یہ ہمہ گیر ہلاکت و بربادی کا تماشہ دیکھا۔ خود اقوامِ متحدہ خاموش رہی اور ہے۔ کم و بیش ساٹھ لاکھ مہاجرین فالج زدہ، لٹے لٹائے پاکستان پہنچے۔ کسی کو یہ قیامت دیکھ کر خیال نہ آیا کہ ان مہاجرین کو اپنے ہاں جگہ دے دیں یا دنیا کے کسی اور گوشہ میں ہی آباد کرا دیں۔ مسئلہ کی نوعیت دونوں حالتوں میں ایک ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مسئلہ یہودیوں کی نسبت زیادہ وسیع اور اہم ہے۔

جہادِ حریت

انگریز نے ان سب امور کو بالائے طاق رکھا اور یہودی محبت کے جنون میں اپنے مصالح و مفاد کو بھی بھول گیا۔ رائل کمیشن نے جب پہلی مرتبہ تقسیم کا حل پیش کیا تو برطانیہ کے عزائم کا عربوں کو اندازہ ہو گیا۔ جنگ کے دوران کے دلفریب الفاظ جمعیۃ اقوام

کے بلند بانگ کاغذی اصول، انتداب کا ادعائے آزادی، سب منافقت پر مبنی تھے۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ فلسطین میں ہمہ گیر مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب کے یہ مظاہرے ان علاقوں میں خصوصیت سے زیادہ تھے جن کے متعلق تجویز تھی کہ انہیں یہودی علاقہ میں تبدیل کر دیا جائے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی آغاز جنگ عالمگیر ثانی تک فلسطین جنگ سے دوچار رہا۔ ایک طرف مخلص اور مفلس عرب تھا۔ جس نے اپنا سب کچھ انگریز کی خاطر قربان کیا۔ اس فریب میں کہ وہ آزادی حاصل کر سکے گا۔ دوسری طرف انگریز تھا جس نے غلاموں کی آزادی خواہی کو عظیم الشان فریب دے کر انہیں مفت میں خرید لیا تھا۔ سابقہ دوستوں کا ہاتھ پرانے دوست سے حق دوستی کا تقاضا کر رہا تھا۔ اور پرانا دوست، سنگین، توپ، ہوائی جہاز سے اس کے جان و مال سے کھیل رہا تھا۔ اس جہادِ حریت کے قائد مفتی اعظم حسینی تھے۔

ڈاکٹر ماڈ رائڈن نے اپنی کتاب THE PROBLEM OF PALESTINE میں اس جہاد کا مختصر سا نقشہ بیان کیا ہے وہ لکھتی ہے:۔

(انگریز کی طرف سے) تشدد کا جواب تشدد سے دیا جا رہا ہے۔ عرب دیہات پر حملے کئے جاتے ہیں اور حکومت کی فوج انہیں برباد کر دیتی ہے۔ تعزیری کارروائیاں جاری ہیں۔ ان میں ہوائی بمباری، گھروں کو بارود سے اڑا دینا، دیہات کی تباہی، مال و دولت کی بربادی، سب شامل ہیں۔ ملک میں حرکت و آمد و رفت دشوار ہو گئی ہے اور کرفیو کا راج ہے۔ مشتبہ افراد کو قیدیوں کے کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے اور بغیر مقدمہ چلائے محبوس رکھا جاتا ہے۔ دوسروں کو جزائر سیچل میں بغیر مقدمہ چلائے بھیج دیا جاتا ہے۔ کئی جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور کئی موت کے گھاٹ اتارے جا چکے ہیں۔

یہ لرزہ خیز داستان ہے، ان کے لئے ناقابلِ برداشت جو برطانیہ، اس کے مذہب اور اس کے سپاہیوں کے نام کو عزیز سمجھتے ہیں۔ میں اس پر اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گی کہ آئرلینڈ کے زمانہ TANS اور BLACK کے بدترین کوائف کو اس ملک میں دہرایا جا رہا ہے جسے سب عیسائی یہودی اور مسلمان مقدس سمجھتے ہیں جن لوگوں نے اس فلسطین کو دیکھا ہے جس کا میں ذکر کر رہی ہوں، ان کے لئے سرکاری تردیدی بیانات کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ انتہائی تشدد بیکار ثابت ہوا ہے اور اس سے منافرت اور بڑھی ہے۔ بارہا عرب مردوں اور عورتوں نے مجھ سے کہا ہے: اگر برطانوی فوج چوبیس گھنٹے چھٹی لے لے تو فلسطین میں ایک بھی یہودی زندہ نہ رہے۔ یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو طبعاً نرم ہیں اور جو اسی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کا مزید داخلہ بند کر دیا جائے تو کل امن ہو سکتا ہے۔

عربوں کے جوش و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ:

ایک صاحب نے، جن کا ذخیرہ فرلیضہ یہ تھا کہ وہ ان قیدیوں سے ملیں جنہیں تشدد کے جرم میں موت کی سزا ملی ہے، مجھ سے بیان کیا کہ انہوں نے ایک مجرم کو دیکھا کہ وہ دو زانو ہو کر اللہ کا ہزار ہزار شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے اسے ملک اور مذہب کی خاطر جان دینے کی عزت عطا کی۔ ایک عرب (عیسائی) عورت نے مجھے بتایا کہ ایسے بیٹے کی ماں سے جب اس نے اظہار تعزیت کیا تو اس ماں نے اس ہمدردی کو فخر و غرور سے رد کر دیا۔ ایک ماں جس کا بیٹا اللہ نے یوں منتخب کیا ہو، قابلِ رحم نہیں، قابلِ عزت ہے۔ (ایضاً)

برطانیہ ذہنی طاقت کے زعم میں اپنے جور و استبداد پر قائم رہا۔ بمبار ہوائی جہازوں کے سایہ میں ۱۹۳۸ء میں اس نے وڈہیڈ کمیشن WOOD HEAD COMMISION بدیں مقصد فلسطین بھیجا کہ وہ تقسیم کے عملی پہلو سے متعلق رپورٹ پیش کرے۔ کمیشن کی علت تشکیل تقسیم پر رائے زنی نہیں تھی بلکہ تقسیم کی جزئیات طے کرنا تھی۔ کمیشن کی رپورٹ معلومات سے پُر ہے۔ اس نے سابقہ تجویز سے کہیں کہیں اختلاف کیا اور نئی تحدید پیش کی۔ رپورٹ کے ایک ایک صفحہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے۔ یہ خاموش اعتراف نمایاں ہے کہ تقسیم ناقابلِ عمل ہے۔ چنانچہ کمیشن نے مجوزہ اجزائے فلسطین کی تحدید کے لئے فوجی قوت کی ضرورت پر زور دیا۔ گویا کمیشن نے یہ تسلیم کر لیا اور حکومت برطانیہ کو بتا دیا کہ تقسیم کے لئے تلوار ناگزیر ہے۔

برطانیہ کی پالیسی میں تبدیلی

۱۹۳۹ء میں برطانوی حکومت نے عرب اور یہودی زعماء کو مذاکرات کے لئے لندن بلایا۔ برطانیہ کا اعتماد عربوں کے دلوں سے اٹھ چکا تھا۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۹ء تک کے پچیس سالوں کے انگریزی، عربی تعلقات افسوسناک داستان کے حامل ہیں۔ اتنی بدعہدیوں اور جور و تعدی کے بعد عرب انگلستان کے خلوصِ نیت کے کیسے قائل ہو سکتے تھے؟ انہوں نے پوری جرأت سے کام لیا اور استقامت سے اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ان کے جذبات کی گہرائی کا اندازہ یہاں سے لگ سکتا ہے کہ انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ایک میز کے آس پاس بیٹھ کر مصروفِ گفتگو ہونے سے انکار کر دیا۔ برطانیہ نے مجبوراً جانبین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی لیکن کوئی مصالحت کی صورت نہ بن سکی۔ برطانیہ نے بالآخر ۱۹۳۹ء کا مشہور قرطاسِ ابیض شائع کیا جس میں ان کا اپنا حل پیش کیا گیا تھا۔

اس قرطاس کی رو سے یہودیوں کی آمد پر سے مزید پانچ سال تک کے لئے پابندی ہٹا دی گئی اس شرط کے ساتھ کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ ہزار سالانہ کی رفتار سے آسکیں گے۔ یعنی وہ کل پچھتر ہزار کی تعداد میں آئیں گے۔ پانچ سال کے بعد مزید آمد عربوں کی رضامندی پر منحصر ہوگی۔ ہائی کمشنر کو یہ بھی ہدایات دی گئیں کہ وہ ایسے قوانین بنائے جن سے یہودی، عربوں کی مملوکہ زرعی زمین آسانی سے نہ خرید سکیں۔ بعض مخصوص علاقوں میں خرید و فروخت حکومت فلسطین کی اجازت سے ہو سکے گی۔ دس سال کے بعد یعنی ۱۹۴۹ء میں فلسطین آزاد ہو جائے گا۔

قرطاس کا مطلب صاف ہے۔ یعنی یہودیوں کی تعداد میں مزید پچھتر ہزار کا اضافہ ہو کر فلسطین دس سال کے بعد آزاد عرب حکومت بن جائے گا۔ یہودی اقلیت میں رہیں گے اور عرب حکومت کے شہری بن کر۔ قرطاس ابیض نے تقسیم کو دفن کر دیا اور عربوں کے مطالبات کی صداقت اور بے پناہی کے سامنے برطانیہ کی قوت و شوکت نے ایک حد تک سپر ڈال دی۔ عربوں اور یہودیوں نے اس فیصلہ کو تسلیم نہ کیا۔ اور اسی حال میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہو گئی۔ برطانیہ نے اپنی طرف سے زمینوں کی خرید و فروخت اور یہودیوں کے داخلہ سے متعلق "پابندیوں" پر عمل درآمد شروع کر دیا۔

۱۹۴۵ء میں جنگ کے خاتمہ پر یورپی یہودیوں کی آمد کا دباؤ کافی بڑھ چکا تھا۔ صیہونیت فلسطین پر چھا جانے پر مصر تھی۔ قرطاس ابیض کی رو سے فلسطین کے دروازے بند ہو چکے تھے اور وہ عربوں کی رضامندی ہی سے کھل سکتے تھے۔ ادھر عرب جو پہلے بکھرے بکھرے تھے نہ محض فلسطین کے مسئلہ پر ہی بلکہ دیگر مشترک امور پر بھی متحد و متفق ہو گئے۔ یہ اتحاد و اتفاق ۲۲ مارچ ۱۹۴۵ء کو عرب لیگ کی باقاعدہ تشکیل میں ظاہر ہوا۔ عرب لیگ کی تشکیل کے بعد فلسطین کا معاملہ مقامی نہیں رہا بلکہ جملہ عالم عرب کا مشترک مسئلہ بن گیا۔ یہ مسئلہ یوں بھی فلسطین کے مقامی باشندوں کا کب تھا۔ فلسطین عربوں کا ہی نہیں مسلمانانِ عالم کا ہے اور تمام عالم اسلامی اس پر متفق ہے۔

انگلستان میں جنگ کے بعد، حزب عمال برسر اقتدار آئی۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات عامہ سے جو نئی پارلیمان مرتب ہوئی اس میں سولہ یہودی ارکان تھے۔ خود عمال حکومت میں ایک وزیر اور دو نائب معتمد یہودی تھے۔ یہودیوں کو اپنے اس اثر و اقتدار کے باعث یقین تھا کہ وہ فلسطین کا فیصلہ حسب منشاء کرا سکیں گے۔ لیکن جب وزیر خارجہ برطانیہ نے معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر چکانا چاہا، تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ قضیہ اتنا آسان نہیں جتنا یہودی شرکائے اقتدار بتا رہے تھے۔ ایک طرف یہودی دباؤ تھا اور دوسری طرف ممالک عربیہ کی لیگ کی متفقہ مخالفت۔ قبل اس کے کہ برطانیہ کوئی اقدام کرتا، خبر مشہور ہو گئی کہ ٹرومین صدر امریکہ برطانیہ سے اپیل کرنا چاہتا ہے کہ کم از کم اور ایک لاکھ یہودی فلسطین میں فی الفور لے لئے جائیں۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پچھتر ہزار یہودی تو "جائز" طریقے سے آ گئے تھے، لیکن ان کی ناجائز آمد کبھی مکمل طور پر بند نہیں ہوئی تھی۔ اس پر مستزاد ایک لاکھ اور تھے جنہیں صدر امریکہ خواہی نخواہی فلسطین پر ٹھونسنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ ۱۹۴۸ء میں ہونے والا صدارتی انتخاب تھا۔ امریکہ کے پریس اور حکومتی اداروں میں یہود کا بے پناہ اثر و رسوخ تھا۔ انتخابات کے موقع پر مخالف فریق یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کی خوشامدیں کرتے ہیں۔ بقول شخصے، اس موقع پر امریکہ پاگل ہو جاتا ہے۔ ٹرومین کو ڈر تھا کہ اس نے یہ اپیل نہ کی تو اس کی حریف ری پبلکن پارٹی ایسا کر دے گی۔ اس صورت میں یہودی ووٹ ٹرومین کے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ محض اپنی انتخابی جیت کے لئے امریکہ کی دونوں پارٹیاں فلسطین کو جہنم میں جھونک دینے پر تیار رہتیں۔

ٹرومین کی اپیل کے جواب میں برطانیہ نے امریکہ کو دعوت دی کہ اگر وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرانا چاہتا ہے تو نتائج کی ذمہ داری لے اور یورپ میں یہودیوں کی حالت نیز فلسطین کی صورت حال کی پوری تحقیقات کرے۔ ٹرومین نے جھجکتے ہوئے یہ دعوت قبول کر لی۔ اس پر ایک مشترکہ انگلستانی و امریکی کمیشن مرتب ہوا جسے ہدایت دی گئی کہ وہ چار مہینوں کے اندر اندر رپورٹ پیش کر دے۔ کمیشن کی متفقہ سفارشات ظاہر ہے نہ عربوں کو مطمئن کر سکتی تھیں نہ یہودیوں کو لیکن رپورٹ عربی مطالبات کی بے پناہی کا مزید اعتراف تھا۔ بہرحال کمیشن نے ٹرومین کا مطالبہ من و عن تسلیم کر لیا کہ

ایک لاکھ یہودی فوراً فلسطین میں داخل ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ، امریکہ اور دیگر حکومتوں سے درخواست کی گئی کہ وہ بے وطن یہودیوں کے لئے یورپ میں کسی جگہ نئے گھر کی تلاش کریں اور اس ضمن میں فوری اقدام کریں۔ کمیشن نے نہ تو فلسطین کی آزادی کی سفارش کی، نہ عرب حکومت کی، نہ یہودی حکومت کی۔ بلکہ ایسی وہ قومی حکومت کا مشورہ دیا جس میں عرب اور یہودی مساوی حقوق شہریت کے مالک ہوں۔ مزید رائے یہ تھی کہ فلسطین کو غیر معین عرصہ کے لئے انتداب سے نکال کر تولیت میں رکھ دینا چاہیئے۔ زمینوں کی موجودہ پابندیوں کی تنسیخ کی رائے دیتے ہوئے کمیشن نے ایسی تجاویز پیش کیں جن سے عرب کسانوں وغیرہ کے اس ضمن میں حقوق کی نگہداشت مقصود تھی۔ آخری سفارش یہ تھی کہ جانبین کے تشدد کو سختی سے دبا دیا جائے۔

ایک دفعہ پھر "ثابت" کر دینے کے علاوہ کہ تقسیم فلسطین ناقابل عمل اور ناممکن ہے، معاملہ آگے نہ بڑھایا جا سکا۔

فلسطین اقوام متحدہ میں

انتداب عملاً برطانیہ کے لئے ایک مہنگا سودا ہو گیا تھا۔ انتدابی عرصے میں برطانیہ کو جان اور مال کا بھاری نقصان اٹھانا پڑا ——— انگریز اس زیان سے تنگ آ گیا۔ کیونکہ جنگ نے برطانیہ کے لئے ایسی گوناگوں مشکلات پیدا کر دی تھیں کہ فلسطین کی کمر ہمت توڑ رہا تھا۔ ناچار برطانیہ نے ۲۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش کر دیا۔

فلسطین اپنی مخصوص تاریخ کے اعتبار سے ایک قطعہ ارض نہیں رہا۔ جغرافیہ نے اسے کچھ ایسی اہمیت دی ہے کہ تاریخ ہمیشہ مصیبت میں مبتلا رہی۔ سطور بالا سے ظاہر ہو گا کہ فلسطین کانٹوں کی سیج پر ہی رہا۔ اسی اہمیت نے اسے پھر بین الاقوامی استخوان نزاع بنا دیا ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ میں ہر چند برطانیہ، امریکہ اور روس متحد تھے۔ لیکن ان کے باہمی اختلافات کبھی رفع نہ ہو سکے۔ امن ہوا تو جنگ کے یہ اتحادی دو فریقوں میں بٹ گئے۔ جنگ کا جو عظیم الشان بار برطانیہ پر پڑا، اس سے وہ اپنی پہلی عظمت و استقامت بہت حد تک ضائع کر چکا ہے اور اب وہ امریکہ کا دست نگر ہے۔ امریکہ ایک امیر و متمول ملک ہے اور اسے جنگ نے کم سے کم نقصان پہنچایا۔ امریکہ آئندہ جنگی ممکنات کے خوف سے اس حیثیت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ روس بھی اپنے استحکام میں دیوانہ وار مصروف و منہمک ہے۔ مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ کا بیشتر حصہ اس کا ہے۔ مشرق وسطیٰ کی اہمیت ظاہر ہے۔ جغرافیائی اہمیت پر مستزاد مشرق وسطیٰ کا تیل ہے۔ تیل آئندہ جنگ کی اشد ترین ضرورت ہے۔ ممالک عربیہ کا تیل ایک حد تک برطانیہ اور زیادہ حد تک امریکہ کے قبضہ میں ہے۔ روس کے اپنے تیل کے ذخائر کافی ہیں۔ لیکن وہ تیل کی دوڑ میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا۔ ایران میں اسکی دلچسپی اسی ذہنیت کی آئینہ بردار ہے۔ ترکی اور ممالک عربیہ میں بھی اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ امریکہ کی اپنی تیل کی پیداوار کافی ہے، لیکن اس کے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ذخائر کے جلدی ختم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ مشرق وسطیٰ کا تیل مقابلتاً نو انکشاف۔ وہ کمیت اور کیفیت دونوں میں زیادہ ہے۔ چنانچہ اس تیل نے بین الاقوامی مسابقت پیدا کر دی ہے۔ تیل اور سیاست ایک ہو گئے ہیں۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک اپنی پسماندگی کے طفیل

چونکہ خود تیل کی پیداوار سے قاصر ہیں، اس لئے یہ نعمت عظمیٰ ان کے لئے وبالِ جان بن گئی ہے۔ روس اور امریکہ کی انتہائی خواہش اور کوشش ہے کہ وہ ان علاقوں پر اپنا تسلط قائم رکھیں۔ فلسطین کی اہمیت۔ پھر بڑھ جاتی ہے کہ کوک (عراق) سے تیل کی نالی (پائپ لائن) حیفہ (فلسطین) میں منتہی ہوتی ہے۔ حیفہ سے آگے تیل بذریعہ بحری جہاز لے جایا جاتا ہے۔ یہ لائن چھ سو بیس میل لمبی ہے۔ اس سے اس علاقہ کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ فلسطین کا انتداب اور دیگر متبادل تجاویز اسی سیاسی تسلط کی غماز ہیں۔

بہرکیف فلسطین کا معاملہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہو گیا۔ اقوام متحدہ نے ایک خصوصی کمیٹی گیارہ ارکان پر مشتمل متعین کی جو فلسطین میں جا کر حالات و کوائف کا مطالعہ کرے اور اپنی سفارشات پیش کرے۔ کمیٹی مذکورہ نے ڈھائی ماہ کے بعد دو رپورٹیں پیش کیں۔ ایک اکثریت کی جس پر سات ارکان کے دستخط تھے، اور دوسری اقلیت کی جس پر تین ارکان کے دستخط تھے (ایک رکن غیر جانبدار رہا) اکثریت کی رپورٹ نے تقسیم کی تجویز پیش کی اور اقلیت نے ایسے وفاق کی جس کے اجزاء عربی اور یہودی ریاستیں ہوں۔ عربوں نے ان میں سے کسی تجویز کو بھی قبول نہ کیا لیکن یہودیوں نے اکثریت کی رپورٹ کو منظور کر لیا۔ اقلیت کی رپورٹ کو یوں بھی اقوام متحدہ کے حلقوں میں کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اقوام، دو صفوں میں بٹ گئیں، ایک تقسیم کے حق میں اور دوسری تقسیم کے خلاف یعنی عربی وحدانی حکومت کے حق میں۔ اس پر فلسطین کمیٹی کی دو سب کمیٹیاں بنا دی گئیں جو متعلقہ تجاویز پر پوری طرح غور و خوض کریں۔ اور اپنی سفارشات پیش کریں۔ کمیٹی نمبر (۱) ان ارکان پر مشتمل تھی جو تقسیم کے حامی تھے، دوسری سب کمیٹی وحدانی حکومت کے حامیوں پر مشتمل تھی (اس میں چھ عرب ریاستیں اور افغانستان اور پاکستان تھے) پہلی سب کمیٹی کی صدارت مندوب پولینڈ کے سپرد تھی اور دوسری کی مندوب پاکستان چودھری ظفر اللہ خان کے سپرد۔

تقسیم کا فیصلہ

سب کمیٹی نمبر ۲ نے اپنی مدلل و معقول رپورٹ[1] میں اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جمعیۃ اقوام متحدہ تقسیم فلسطین کی مجاز نہیں۔ یوں تو جمعیۃ اقوام کو بھی یہ حق حاصل نہ تھا کہ وہ فلسطین کو برطانیہ کے زیر انتداب کر دے، لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے تو وہ مجلس عرصہ سے ختم ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے حقوق و اختیارات کسی دوسری مجلس کے نام منتقل نہیں کئے تھے۔ اقوام متحدہ بالکل نیا ادارہ تھا۔ اسے فلسطین کے مستقبل سے متعلق کسی قسم کا فیصلہ کرنے کا حق و اختیار نہیں تھا۔ چہ جائیکہ وہ تقسیم کا فیصلہ صادر کرتا اور پھر اسے خواہی نخواہی مسلط کرتا۔ اس کے علاوہ جب انتدابی حکومت نے اعلان کر دیا کہ انتداب ختم کر دیا جائے گا تو فلسطین کو لامحالہ آزاد ہونا چاہیئے۔ برطانیہ نے اپنی روش ایسی کر لی تھی کہ فلسطین اقوام متحدہ کے سپرد ہے۔ وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں، برطانیہ ان کے فیصلہ کا پابند ہوگا لیکن خود کسی قسم کی رائے یا مشورہ

---

[1] پولینڈ کے مندوب یعنی سب کمیٹی ۱ کے صدر نے سب کمیٹی ۲ کے صدر سر ظفر اللہ خان کے سامنے اعتراف کیا کہ آپ کی رپورٹ ہماری رپورٹ سے بدرجہا بہتر ہے۔ بقول ظفر اللہ خان اس سے اس کا مقصد سفارشات کی تائید نہیں تھا۔ بلکہ معلومات و انداز استدلال کی تعریف تھی۔

نہیں دے گا۔ وہ نہ تقسیم کے حق میں ہے نہ تقسیم کے خلاف۔ وہ اس فیصلہ کی تائید کرے گا جسے عرب اور یہود دونوں تسلیم کریں گے۔ برطانیہ نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو انتداب ختم کر دے گا اور فلسطین خالی کر دے گا۔ اختتام انتداب تک وہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرے گا۔ اور امن و امان کا تنہا محافظ ہوگا۔ اس کی فوجیں یکم اگست تک فلسطین سے نکل آئیں گی۔ ۱۵ مئی کے بعد وہ فلسطین کے لئے ذمہ دار نہیں ہوگا۔ گویا وہ فلسطین کے بعض حصّوں پر قبضہ کرنے کے لئے یہودیوں کا راستہ بالکل ہموار کر دے گا۔

سب کمیٹی نے منشور اقوام متحدہ کے پہلے ضابطہ کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی۔ جس میں مذکور ہے کہ اقوام متحدہ کے مقاصد میں سے ایک یہ ہے کہ اقوام کو حق خود اختیاری میسّر آئے اور وہ اپنی حکومت اپنی رضامندی سے طے کریں۔ اس کے مطابق فلسطین کا فیصلہ اہل فلسطین کے سپرد ہونا چاہیئے تھا، نہ کہ اقوام متحدہ کے سپرد۔

یہودی تارکین وطن کے داخلہ فلسطین سے متعلق کمیٹی مذکورہ نے بتایا کہ چونکہ فلسطین اب تک تین لاکھ یورپی یہودیوں کو پناہ دے چکا ہے، اس لئے اس کے رقبے، ذرائع اور دیگر عناصر کے پیش نظر اس داخلہ کو بند کر دینا چاہیئے اور یہودی مسئلہ کو بین الاقوامی خطوط پر طے کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل مشورے دیئے گئے۔

۱۔ جن یہودیوں کو اپنے گھروں سے زبردستی نکال دیا گیا ہے (اب چونکہ یورپ میں ان پر وہ ظلم و ستم نہیں ہو رہا، اس لئے) ان میں سے جتنے بھی ممکن ہوں اپنے گھروں میں واپس کر دیئے جائیں۔

۲۔ جو بآسانی اپنے گھروں میں واپس نہیں بھیجے جا سکتے ان کو ارکان متحدہ میں ان کی حکومتوں کی آبادی، رقبہ، ذرائع اور گنجائش کے مطابق تقسیم کر دیا جائے۔

۳۔ ایک ایسی کمیٹی مرتب کی جائے جو ہر ملک میں یہودیوں کے بسانے کی تعداد وغیرہ مقرر کرے۔

فلسطین کی آئندہ حکومت وحدانی طرز کی تجویز کی گئی جس میں تمام اقلیتیں شریک ہوں اور ان کے لئے مناسب تحفظات ہوں۔

یہ سفارشات تبصرہ سے مستغنی اور مسئلہ زیر نظر کا صحیح حل تھیں۔ لیکن حل کی صحت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اقوام متحدہ کے پیش نظر تو متضاد سیاسی مصالح تھے جن میں تطبیق محال تھی —— لہذا حل ناممکن!

کمیٹی ۱ نے تقسیم کے حق میں سفارش کی۔ رسمی مراحل کے بعد معاملہ ۲۶ نومبر ۱۹۴۷ء کو جنرل اسمبلی میں مباحثہ کے لئے پیش ہوا۔ تقسیم کا فیصلہ کیسے ہوا؟ یہ دلچسپ داستان ہے اور مختصراً چودھری ظفر اللہ خان کی زبانی پیش کرتے ہیں۔

> ۲۷ نومبر امریکہ کا تہوار ہوتا ہے یوم تشکر (THANKS GIVING) کہا جاتا ہے۔ اس لئے ہر رکن حتی کہ صدر تک کی خواہش تھی کہ نشست ۲۶ (بدھ) کی نیم شب تک ختم کر دی جائے۔ اسی اعتبار سے جانبین نے اس دن اپنی ساری قوتیں مرکوز کر لیں۔ تقسیم کے خلاف ۱۶ ووٹ جمع ہو گئے تھے۔

چونکہ ایسے معاملوں کے لئے دو تہائی اکثریت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے تقسیم کے حق میں ۳۲ ووٹ درکار تھے۔ یہ قریباً ناممکن سا نظر آتا تھا۔ ہمیں یقین ہو گیا تھا کہ ہم نے میدان مار لیا ہے۔ اور تقسیم دفن ہو گئی ہے۔ اس اثناء میں افواہ مشہور ہو گئی کہ سیشن ملتوی ہو جائے گا اور ۲۸ تاریخ یعنی جمعہ کو منعقد ہو گا اور اسی دن ووٹ بھی لئے جائیں گے۔ صدر سے بات کرنے پر معلوم ہوا کہ ایسا ہی ہو گا۔ اسے بتایا گیا کہ دو دن کے وقفہ سے ہمارے ووٹ ضائع ہو جائیں گے لیکن کسی نامعلوم شخص نے التواء کے لئے کہا اور بالآخر سیشن ملتوی کر دیا گیا۔ یہ قابلِ ذکر ہے کہ گزشتہ سال یوم تشکر کو اسمبلی کا سیشن منعقد ہوا تھا۔ لیکن اب یہ بہانہ کر دیا گیا کہ اس دن کو چونکہ امریکہ کی تعطیل ہوتی ہے اس لئے سیشن منعقد نہیں کیا جا سکتا۔ اس وقفہ میں نیویارک کے اخبارات میں خبر آئی کہ یہودی لیڈر ٹرومین سے ملے۔ انہوں نے یہ دھمکی دی کہ اگر تقسیم ناکام ہو گئی تو بحالی یورپ کا بل ناکام کر دیا جائے گا۔ امریکہ کا سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ٹیلیفون اور تار کے ذریعہ تقسیم کے خلاف کئی مندوبین کی حکومتوں سے مصروفِ گفتگو ہوا اور انہیں اپنی ہدایات بدل دینے پر مجبور کیا۔ اس پر ہمارے ووٹ ۱۳ رہ گئے۔ ایسے مندوبین نے ہم سے معذرت کرتے ہوئے اس مجبوری کا اظہار کیا کہ ان کی حکومتوں نے حکم دے دیا ہے کہ ووٹ تقسیم کے حق میں دیئے جائیں۔ مثلاً (HAITI) کے ـــــ نمائندہ کی آنکھوں میں آنسو تھے جب اس نے کہا کہ ہم نے اعلان کر رکھا تھا کہ ہم تقسیم کے خلاف ووٹ دیں گے۔ لیکن ہمیں اس کے حق میں رائے دینے کی ہدایت آ گئی ہے۔

مسٹر روزویلیٹ نے کہ آنجہانی صدر روزویلیٹ کے پوتے ہیں۔ مڈل ایسٹ جرنل کی اشاعت جنوری ۱۹۴۸ء میں اقوامِ متحدہ میں مسئلہ تقسیم کے فیصلے میں صیہونی دباؤ کا یوں ذکر کیا ہے۔

ارکانِ اقوامِ متحدہ پر اثر ڈالنے کے لئے (تاکہ وہ جنرل اسمبلی میں تقسیم کے حق میں ووٹ دیں) ٹیلی فونوں، تاروں، خطوں، ملاقاتوں اور سیاسی اور اقتصادی دباؤ کا طوفان امڈا چلا آ رہا تھا۔ یہودیوں نے ان اقوام کو جو تقسیم کے خلاف رائے دینا چاہتی تھیں، تقسیم کے حق میں رائے دینے پر مجبور کر دیا یہ سب کچھ اعادہ تھا اس کا جو کچھ نیویارک سٹیٹ کے انتخابات میں ہو چکا تھا۔

یہ کیفیت ہے اس دولت عظمےٰ کی جس کے سپرد دوسری عالمگیر جنگ نے اقوامِ عالم کی قیادت کر دی ہے اور یہ ہے منتظم اس ادارہ اقوامِ متحدہ کا جو اس لئے معرضِ تشکیل میں آیا کہ کرۂ ارض سے جنگ کو بدر کر دیا جائے۔ اور اقدارِ انسانیہ کو مستقل حیثیت دے کر امن و امان کو عام اور پائندہ کیا جائے۔ عراقی نمائندہ کے الفاظ میں صدر ٹرومین نے ہی فلسطین کو آگ لگائی ہے اور وہی اسے بجھا سکتا ہے۔ یہ بین الاقوامی ریشہ دوانیاں سیاست دولِ عظمےٰ کا طغرائے امتیاز ہیں اور انہی نے فلسطین کو عقدہ لاینحل بنا رکھا ہے۔

ان حالات میں ۲۹ نومبر کو جنرل اسمبلی نے تقسیم کا فیصلہ صادر کر دیا۔ ۵۷ ووٹوں میں سے ۳۳ تقسیم کے حق میں تھے، ۱۳ مخالف، دس ارکان غیر حاضر رہے۔ رائے شماری کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ امریکہ باوجود ساری ریشہ دوانیوں کے دو تہائی ووٹ حاصل نہیں کر سکا۔ جو ارکان غیر حاضر تھے وہ تقسیم کے خلاف تھے۔

گویا کہا جا سکتا ہے کہ ۳۳ کے مقابلہ میں ۲۳ ووٹ تھے۔ یہ کثرت رائے تو ہے، دو تہائی ووٹ نہیں بہرکیف یہودی ووٹوں کی خاطر تقسیم کا فیصلہ صادر کرا دیا گیا۔ قبل اس کے کہ امریکہ کی مشکلات کا ذکر کیا جائے، تقسیم کے مالہ، وما علیہ پر ایک طائرانہ نگاہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

تقسیم کا خاکہ اس فیصلہ کے مطابق فلسطین عربوں اور یہودیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ یروشلم کو بین الاقوامی شہر قرار دیا گیا۔ سارے ملک کو ایک مشترکہ اقتصادی بورڈ کے ماتحت کر دیا گیا جس کے ارکان میں سے تین عرب، تین یہودی اور تین اقوام متحدہ کی اقتصادی اور معاشرتی کونسل کے نمائندے تھے۔ ہر چند یہ فیصلہ تقسیم کا تھا لیکن مشترکہ اقتصادی بورڈ رکھ کر ایک مرتبہ پھر عملی اعتراف کیا گیا کہ اس ملک کی تقسیم ناقابل عمل ہے۔

یہی سلطنت تین حصوں پر مشتمل تھی۔ شمال میں مشرقی گیلیلی جس کی سرحدیں شام اور لبنان سے ملتی ہیں۔ وسط میں تل ابیب (TEL AVIV) کی بندرگاہ اور ساحلی میدان، جنوب میں نجف (NEGEV) پہلی تجویز کے مطابق جافا کی بندرگاہ یہودی سلطنت میں شامل تھی۔ اس کے مطابق یہودی حصہ ملک میں پانچ لاکھ نو ہزار سات سو اسی (۵۰۹۷۸۰) عرب تھے۔ اور چار لاکھ ننانوے ہزار بیس (۴۹۹۰۲۰) یہودی۔ گویا یہودی حصہ میں عربوں کی اکثریت تھی۔ اس غیر معقول، غیر منصفانہ تقسیم کے لئے وجہ جواز یہ پیش کی گئی، کہ یہودی بیرونی یہود کی آمد سے اپنی آبادی جلدی بڑھا لیں گے اور پھر وہ اکثریت میں ہو جائیں گے۔ جافا نکال دینے کے بعد یہودی علاقہ میں چار لاکھ اٹھانوے ہزار (۴۹۸۰۰۰) یہودی اور چار لاکھ پینتیس ہزار (۴۳۵۰۰۰) عرب رہ گئے ——— فلسطین کی کل آبادی بیس لاکھ ہے، جس میں سے تیرہ لاکھ عرب ہیں اور چھ لاکھ پچاس ہزار یہودی۔ تقسیم کے حامی یہ دلیل دیتے تھے کہ یہودی آبادی کو عربوں کے ماتحت اقلیت بنے رہنے پر مجبور کرنا ——— ناانصافی اور ظلم ہے۔ لیکن یہ دلیل دینے والے عربوں کو بالکل نظرانداز کر رہے تھے۔ اگر یہودیوں کو اقلیت بنانا ظلم تھا تو عربوں کو اقلیت بنا دینا کہاں کا انصاف تھا؟ یہودی کل آبادی کا ۳۳ فی صدی تھے۔ اس کے برعکس یہودی علاقہ میں عرب ۴۸ فی صدی تھے۔ گویا ۳۳ فی صدی کو ۶۷ فی صدی کی حکومت کے تحت اقلیت رکھنا تو ظلم تھا لیکن ۴۸ فی صدی کو ۵۲ فی صدی کے تحت اقلیت بنا دینا ظلم نہیں تھا، عین انصاف تھا۔ مجموعی آبادی کو چھوڑ کر مختلف اجزاء کی علیحدہ آبادی لی جائے تو معاملہ اور مضحکہ انگیز ہو جاتا ہے گیلیلی میں چھیاسی ہزار عربوں کے مقابلہ میں اٹھائیس ہزار یہودی تھے۔ نجف کی ایک لاکھ دو ہزار کی آبادی میں صرف دو ہزار (پھر سنیئے، صرف دو ہزار) یہودی تھے۔ وسطی علاقہ میں ساٹھ فی صدی یہودی اور ۴۰ فی صدی عرب۔ اگر فلسطین کے انتظامی حصوں کو علیحدہ علیحدہ لیا جائے تو یہودیوں کی حالت اور نحیف ہو جاتی ہے ——— فلسطین کے ۱۴ یا ۱۶ انتظامی حصوں میں سے صرف ایک یعنی حیفہ میں یہودیوں کی اکثریت تھی۔ باقی ہر جگہ وہ اقلیت میں تھے۔ ان کی حکومت کہاں قائم ہو سکتی ہے؟ آبادی کے علاوہ زمین کی ملکیت میں بھی عرب بڑھے ہوئے تھے۔ یہودی علاقہ میں زمین کی نجی ملکیتوں میں عربوں کا ۶۰ فی صدی حصہ تھا اور یہودیوں کا ۴۰ فی صدی۔ اس کے باوجود تقسیم روا رکھی گئی اور یہودیوں کو جو علاقے بخشے گئے وہ زرخیز میدان تھے جنہیں مزید ترقی دی جا سکتی تھی۔ لیکن عربوں کے حصہ میں پہاڑی

علاقے آئے جو ناقابلِ ترقی تھے۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ عربوں کو اقتصادی بورڈ کا محتاج بنا دیا جائے اور بتدریج ان کی ترقی مسدود کر دی جائے۔

امریکہ کی مشکلات

تجویز تقسیم کے بعد پانچ ارکان پر مشتمل ایک کمیشن مرتب کیا گیا تاکہ وہ تقسیم کے نفاذ سے متعلق سفارشات پیش کرے۔ ڈھائی ماہ کے بعد ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء کی شب کو اس کمیشن نے رپورٹ شائع کی جس میں اعتراف کیا گیا کہ صورتِ حال انتہائی نازک ہے اور اس کے مزید بگڑنے کا احتمال ہے۔ عربی قومی اندرون و بیرون فلسطین، جنرل اسمبلی کے فیصلہ تقسیم کو بزورِ شمشیر بدلنے پر کمربستہ تھے اور یہودی بھی علیٰ ہذا القیاس اپنے مطالبہ پر اڑے ہوئے تھے۔ اختتام انتداب پر مکمل بدامنی پھیلنے کا خطرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کمیشن نے اس کے مقابلے کے لئے بین الاقوامی پولیس فورس قائم کرنیکا مشورہ دیا۔ مشورہ ایک لحاظ سے بیجا نہیں تھا کیونکہ اس کا پہلے سے ہی احساس پایا جاتا تھا۔ لیکن امریکہ اس زعم میں تھا کہ وہ محض رعب سے عربی حکومتوں کو خاموش کرا دے گا اور اس کے لئے قوت کی ضرورت نہیں رہے گی۔ عرب، روز بروز اپنے مطالبات میں متشدد ہوتے جا رہے تھے۔ فلسطین کی مجلس اعلیٰ نے فلسطین کمیشن کو بتایا کہ عرب یہودی ریاست کی تشکیل کی ہر کوشش کو اقدامِ جنگ سمجھیں گے اور اس کا پورا مقابلہ کریں گے۔ عرب لیگ کے جنرل سیکرٹری عزام پاشا نے ۱۷ فروری کو اعلان کیا کہ اگر تقسیم کو قوت کے بل بوتے پر مسلط کیا گیا تو باقاعدہ عربی فوجیں تقسیم کا مقابلہ کریں گی۔ عربوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مارچ کے اوائل میں نیویارک ٹائمز کے نامہ نگار متعینہ قاہرہ نے یہ خبر بھیجی کہ عرب لیگ نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ امریکی کمپنیوں کو اجازت نہیں دے گی کہ وہ ارکان عرب لیگ کی مملکتوں کی حدود میں پائپ لائنیں بچھائیں۔ شام کے متعلق خبر آئی کہ اس نے امریکی کمپنی کے اس اجارہ کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا ہے جو چھ ماہ پیشتر طے ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خبر بھی دلچسپی سے خالی نہ تھی کہ مصر بھی عرب لیگ کے فیصلہ کا پابند ہو گا اور حجاز بھی غالباً موجود کمپنیوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے گا۔ حالات نے امریکہ کو یقین دلا دیا کہ عرب گیدڑ بھبکیاں نہیں دے رہے بلکہ وہ واقعی ایسے عزائم رکھتے ہیں۔ فلسطین کمیشن نے عربوں کے عزم غیر متزلزل کی تصدیق کی تو امریکہ کی آنکھیں کھلیں۔ ٹرومین نے محسوس کیا کہ وہ یہودی ووٹوں پر عربوں کو آسانی سے قربان نہیں کر سکتا۔

فلسطین میں بین الاقوامی پولیس کے مسئلہ نے اور مصیبت پیدا کر دی۔ ۲۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو امریکہ نے تقسیم کا فیصلہ منظور کرایا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک کے پانچ مہینوں میں بین الاقوامی صورتِ حال اور نازک ہو گئی تھی۔ چیکوسلوواکیہ میں دیکھتے دیکھتے اشتراکی حکومت مسلط ہو گئی تھی۔ خرشچوف روس کا سایہ فن لینڈ پر پڑ رہا تھا۔ امریکہ روس کے مقابلہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ اس کی نگاہ شمال میں ناروے پر تھی اور جنوب میں اٹلی پر۔ اٹلی میں انتخابات ہونے والے تھے۔ پانچ مغربی قومیں ——— برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، بلجیم، لکسمبرگ کے مابین پچاس سال کا عسکری امداد کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ جسے امریکہ کی "مارشل امداد" کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔ خود ٹرومین ایک مدت تک جہری عسکری تربیت کی اپیل کر چکا تھا۔ ایسے نازک مرحلے پر امریکہ

فلسطین میں بدامنی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بین الاقوامی فوجی مداخلت کا سوال بھی پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اقوامِ متحدہ کے پاس منشور کی رُو سے کوئی ایسی عسکری تنظیم نہیں تھی۔ اور اگر قومیں انفرادی طور پر فوجیں مہیا کرتیں تو روسی فوجیں ضرور فلسطین آ پہنچتیں۔ امریکہ کسی حال میں بھی روسی فوجوں کو فلسطین میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ ان گوناگوں مصائب میں مبتلا اور متضاد صورتوں سے دوچار ہو کر امریکہ نے رجعت کی اور ۱۹ مارچ کو اچانک یہ اعلان کر دیا کہ وہ اب تقسیم کا مؤید نہیں رہا۔ اس کے خیال میں فلسطین کو عارضی طور پر تولیت (TRUSTEE-SHIP) میں دے دیا جائے۔ لہٰذا تقسیم میں جو خطرات و مہالک تھے اور جو سب کو صاف نظر آ رہے تھے، امریکہ نے ان کا انکار کیا، لیکن بالآخر اسے بہت جلد ان کی بے پناہی کے آگے جھکنا پڑا۔ اس رجعت نے نہ محض اس کے اپنے وقار کو صدمہ پہنچایا، بلکہ اقوام متحدہ کے ادارہ کو ایک بے جان اور کھوکھلا ادارہ ثابت کر دیا۔ فلسطین اقوام متحدہ کی آزمائش تھا۔ لیکن وہ اس میں پوری نہیں اتری۔ اس جمعیۃ نے پورے تیرہ مہینے فلسطین کے معاملہ پر بحث و تمحیص کی لیکن ناکام رہی۔

نئی صلیبی جنگ

امریکہ نے عارضی تولیت کی جو تجویز پیش کی وہ بھی منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اسی لیت و لعل، گومگو اور تذبذب میں ۱۵ مئی کی فیصلہ کن تاریخ آ پہنچی۔ برطانیہ فلسطین کو خالی کر کے رخصت ہو گیا۔ یہودیوں نے اسرائیلی سلطنت قائم کر لی اور فلسطین ایک اور صلیبی جنگ کا میدان بن گیا۔ صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں دوسری صلیبی جنگ میں شکست کھا جانے کے بعد صلیبی آج تک خطرے کا باعث نہیں بن سکے تھے۔ آلِ اسرائیل جو ایک دفعہ الٰہی انعام و فضائل سے محروم ہو کر تین ہزار سال سے لعنت و ذلت و مسکنت کی وادیوں میں سرگرداں چلی آ رہی تھی، اپنی ساری شیطنت، مکاریوں کے ساتھ بیت المقدس کی گلیوں میں تہذیب و انسانیت کو ذلیل و رسوا کرنے لگی۔ یہودی "تابوتِ سکینت" کے طالوت کے عہد میں بھی مستحق نہیں تھے۔ اور وہ انہیں بطور انعام خداوندی عطا ہوا تھا۔ تاکہ انہیں "ظالمین" کے بجائے "صابرین" اور "مومنین" بننے کا ایک اور موقع دیا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ آلِ اسرائیل فطرت کی مہلت بخشیوں سے کبھی استفادہ نہیں کر سکی۔ وہ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ چالیس سال صحراؤں میں آوارہ نہیں رہی بلکہ تاریخ کے سارے دور میں وہ صحرا سے نکل کر کسی "مصر" میں داخل نہیں ہو سکی۔ آج وہ سود در سود، اور چور بازار کے ذریعہ کمائے ہوئے سرمایہ سے حاصل کردہ قوت اور اسلحہ سے وہی "تابوتِ سکینت" حاصل کرنے پر مضطرب ہیں جو قوت اور سرمایہ سے نہیں بلکہ قانونِ مشیتِ ایزدی کے تحت ملتا ہے لیکن جو قوم فیضانِ سماوی سے محروم ہو جاتی ہے اس کے عمل و کمالات کی حد یہی فساد و طغیان ہوتے ہیں۔

یہودیوں نے ۱۵ مئی کے بعد فلسطین میں "اسرائیلی حکومت" کا اعلان کر دیا۔ اس کا مرکز تل ابیب ہے۔ اس حکومت کی حیثیت کیا تھی اور اس کی سرحدیں کونسی؟ یہ خود یہودی بھی نہیں جانتے تھے۔ لیکن بین الاقوامی سیاست کی طفلانہ حرکتوں نے اس "حکومت" کو کاغذی نہیں رہنے دیا۔ اسی سال امریکہ کا صدارتی انتخاب ہو رہا تھا۔ صدر ٹرومین گزشتہ انتخاب کے موقع پر نائب صدر منتخب ہوا تھا، لیکن روزویلٹ کی موت پر آئین کے مطابق صدر بن بیٹھا تھا۔ وہ اس منصب کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی جس کا وہ نمائندہ تھا، گزشتہ سولہ سال سے برسر اقتدار چلی آ رہی تھی۔ بعض حلقوں میں اسی وجہ کو اس پارٹی کی شکست کے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ٹرومین

ہر وہ حرکت کرنے کے لئے تیار تھا جو اُسے صدر بنائے رکھنے میں مفید ہوتی۔ یہودی اہم مہرہ تھے۔ چنانچہ ادھر یہودیوں نے بے بنیاد اسرائیلی حکومت کا اعلان کر دیا۔ ادھر صدر ٹرومین نے اسے تسلیم کر لیا۔ شکاگو ٹریبون نے اس حرکت پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸ مئی کی اشاعت میں لکھا۔

ڈپلومیٹک عجلت میں ٹرومین نے ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ (اسرائیلی حکومت) تسلیم کرنے میں ٹرومین نے آدھ گھنٹہ کا بھی انتظار نہیں کیا۔ حکومت کو تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کوئی بھی نہیں جانتا کہ حکومت کیا ہے اور اس کی حدود کون سی ہیں۔ ٹرومین نے یہ کچھ جاننے کا انتظار نہیں کیا۔ اس کی نظر یہودی ووٹوں پر تھی۔ یہی اس کی عجلت کی علت ہے۔

مشرق اردن کے وزیر خارجہ نے کہا کہ مشرق اردن کی اقوام متحدہ کی رکنیت کی درخواست پر حفاظتی کونسل نے کئی مرتبہ سفارش کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن امریکہ نے یہودی حکومت کو بلا وجہ فوراً تسلیم کر لیا ہے۔

امریکہ کے اقدامات میں شریک ہونے کے لئے روس نے بھی اسرائیلی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ امریکہ کے لئے یہ اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ اس نے روس ہی کے ڈر سے تو تقسیم کا فوجی قوت سے نفاذ نہیں کیا تھا۔ روس پھر اس کے مقابل آ کھڑا ہوا۔

جن حالات میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی یہ حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آ جاتی ہے کہ یہ نتیجہ ہے منظم بین الاقوامی سازش کا، یہ دراصل یہودی تلخ ہے اس تخم خبیث کا جسے عیسائیت اپنی روح کی گہرائیوں میں بوتی چلی آئی۔ صلیبی جنگوں میں اسی کی فصل پک کر تیار ہوئی تھی۔ اور ہلال اسلام کی درانتی سے خوب خوب کٹی تھی۔ یورپ کی تہذیب جدید نے اس فصل کی از سر نو آبیاری کی۔ انگریز اس ذہنیت کا زندہ مجسمہ تھا۔ چنانچہ اس کی پوری استعماری تاریخ اس نکتہ کی تفسیر ہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کو اس نے حرف غلط کی طرح مٹانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ سلب و نہب سے بے دست و پا بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس نے برہمن سے مل بھگت کی اور اس مہرے سے انہیں شہ مات دینے میں مصروف و منہمک رہا۔ جب اسے آخر کار برصغیر کو یوں آزاد کرنا پڑا کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا، تو اس نے افراتفری مچا دی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ پاکستان پہلے دن سے ہی یوں ہندو کے رحم و کرم پر ہو جائے، کہ اس کا ہونا، نہ ہونا برابر ہو۔ اس پر بھی وہ اقوام عالم کی صف میں بیٹھ کر پوری ڈھٹائی سے کہتا چلا آ رہا ہے کہ اس نے خوش دلی سے برصغیر کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کیا۔

اس خوش دلی کا مظاہرہ فلسطین میں بھی ہوا۔ یہودی ترک وطن کے برساتی نالوں کا رخ موڑ موڑ کر اس نے یہودی آبادی کو عربوں کے برابر کر دیا اور اسے ایک حکومت کی طرح مسلح ہونے کے مواقع مہیا کئے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ یہودی قزاق ہر طرح تیار ہیں تو از خود اپنے انخلاء کی ایک تاریخ مقرر کر کے فلسطین چھوڑ کے چلا گیا۔ اس نے اختیارات منتقل کرنے کی معروف صورت اختیار نہیں کی۔ اُسے چاہیئے تو یہ تھا کہ حکومت مقامی نمائندوں کو سونپ دیتا اور اگر کسی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ تھا تو اقوام متحدہ سے درخواست کرتا کہ وہ کوئی مناسب متبادل انتظام کر دے، یعنی خود اس انتظام کو سنبھال لے۔ اس نے ایسا نہیں کیا اور عربوں اور یہودیوں کی

جنگ کے باوجود فلسطین کو چھوڑ دیا۔ اسرائیل کو معرضِ وجود میں لانے کی یہی واحد اور یقینی صورت تھی۔ یہودیوں اور عربوں کو لڑتا چھوڑ کر آ جانے کے بعد اس نے اقوامِ متحدہ سے درخواست کی کہ وہ معاملہ کو ہاتھ میں لے۔ اقوامِ متحدہ میں سازش کا رستہ امریکہ نے سنبھال لیا اور اس نے اسرائیل کی غاصب حکومت پر عالمی مہرِ تصدیق مثبت کرا دی اور اس کا راستہ بھی ہموار کر دیا کہ اقوامِ متحدہ نے اپنی تجویزِ تقسیم میں جتنے علاقے یہودیوں کے لیے تجویز کیے تھے۔ وہ ان سے کہیں زیادہ ہتھیا کر بیٹھ جائیں۔ فلسطین کا مسئلہ انیس سال سے اقوامِ متحدہ کے روبرو پیش ہے۔ لیکن وہ اس رکن ملک کو اس حد تک مجبور کرنے پر آمادہ نہیں ہوئی کہ وہ انہیں علاقوں پر قناعت کرنے پر راضی ہو جائے جو اقوامِ متحدہ نے اپنے طور پر انہیں دینا چاہے تھے۔ اس کی وجہ سے گو عربوں کا موقف اقوامِ متحدہ کے باہر یہی ہے کہ غاصب حکومت اسرائیل کو ختم ہونا چاہیئے، لیکن اقوامِ متحدہ کے اندر وہ یہی مطالبہ کرتے چلے آ رہے ہیں کہ اسرائیل کو ان حدود تک محدود کرنے پر مجبور کیا جائے جو اس کے لیے اقوامِ متحدہ نے متعین کی تھیں۔

انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق فلسطین چھوڑ دیا تو فلسطین میں باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ عربوں اور یہودیوں کے درمیان بھی تھی اور عربوں اور عربوں کے درمیان بھی۔ عربوں کے باہمی تعلقات کا یہ عالم تھا کہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑتے لڑتے بھی آپس میں لڑنے سے باز نہ آئے اور لڑے بھی وہ فلسطین ہی کے محاذ پر۔ بلکہ ان کی نگاہ یہودی دشمن پر کم اور عرب ہمسائے پر زیادہ تھی۔ یعنی ان کی کوشش زیادہ تر یہ نہیں تھی کہ یہودیوں کا راستہ روکا جائے۔ بلکہ یہ کہ ان کا دوسرا عرب بھائی فلسطین کا کوئی حصہ یہودیوں سے چھین کر اپنے تصرف میں نہ لے لے۔ انہیں ڈر یہ تھا کہ جس کسی نے بھی فلسطین کا کچھ حصہ آزاد کرایا وہ اسی کی تحویل میں چلا جائے گا۔ اور پھر اس کی سلطنت کی حدود اسی تناسب سے وسیع ہو جائیں گی۔ وہ یہ گوارا نہیں کرتے تھے، کہ کوئی عرب ملک ان کے مقابلے میں اس طرح پہلے سے زیادہ وسیع اور مضبوط ہو جائے۔ اس قسم کا تصادمِ اغراض مصر اور اُردن (جو اُن دنوں شرق اُردن کہلاتا تھا) کے درمیان خصوصیت سے زیادہ تھا۔ اتفاق سے عربوں میں (شرق) اُردن ہی ایک ایسا ملک تھا جس کے پاس منظم اور جنگجو فوج تھی۔ چنانچہ گو مصر نے فلسطین کے جنوبی صحرا کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا، اُردن نے دریائے اُردن کے مغرب کا اچھا خاصا علاقہ آزاد کرا لیا اور مسلمانوں کے متعدد مقاماتِ مقدسہ، حتیٰ کہ یروشلم کے پرانے حصے کو بھی یہودیوں کی دستبرد سے بچا لیا، اس بنا پر وہ شرق اُردن سے اُردن بن گیا۔ لیکن اس طرح ایک ایسی استخوانِ نزاع پیدا ہو گئی کہ عرب آج تک فلسطین کے بارے میں کوئی مشترک لائحہ عمل نہیں بنا سکے۔ اس کا افسوسناک مظاہرہ ابھی حال ہی میں ہوا جب کہ اسرائیل نے اُردن کے خلاف جارحیت کا ثبوت دیا۔ اُن دنوں قاہرہ سے باقاعدہ پروپیگنڈا ہوتا تھا، کہ اردن کی حکومت کو دست بردار ہو جانا چاہیئے۔ گویا قومی مسئلہ اسرائیل کی جارحیت نہیں تھا، شاہ حسین کی معزولی تھا۔

اُردن کا ردِّ عمل اسرائیل کے خلاف بالعموم قابلِ تعریف رہا۔ شاہ حسین اس ناخواندہ اور غاصب مملکت کے اس حد تک خلاف ہیں کہ انہوں نے ایک شاہی مجلس اس مقصد کے لئے قائم کر رکھی ہے کہ اُردن پر جارحانہ

حملہ ہوا تو وہ خود لڑنے کے لئے محاذ پر پہنچیں گے اور اگر وہ کام آ گئے تو یہ مجلس کاروبار حکومت سنبھال لے گی انہوں نے ان فلسطینیوں کو بھی حقوق شہریت دے دیئے جو اُن کے ملک میں آ گئے ہیں۔ لیکن اس سے اصل مسئلہ حل ہونے کی بجائے اور اُلجھا ہے۔ یا یوں کہنا چاہیئے کہ اُلجھا دیا گیا ہے۔ یہودیوں نے جن علاقوں پر تسلط جمایا ہے، ان میں سے مسلمانوں کو نکال دیا گیا ہے۔ ان مہاجرین کو عربوں نے اپنے ہاں ابھی تک آباد نہیں ہونے دیا۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ آباد ہو کر عرب ممالک میں جذب ہو گئے تو فلسطین کو بھول جائیں گے۔ اور اس طرح تحریک، استخلاص فلسطین کو نقصان پہنچے گا۔ اس موقف کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما ہے کہ اگر فلسطینیوں کو متعلقہ ممالک میں آباد ہو جانے دیا گیا تو دریائے اردن کے مغرب میں جو فلسطینی اردن کے قبضے میں آ چکے ہیں، انہیں اور ان کے علاقے کو اردن کا حصہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس سے بچنے کے لئے فلسطینی مظلومین کو اپنا شہری تسلیم نہیں کیا گیا۔ چنانچہ صورت یہ ہے کہ اس وقت کم و بیش تیرہ لاکھ مہاجرین کیمپوں میں گل سڑ رہے ہیں جو علاقہ تو مختلف عرب ممالک میں ہیں لیکن ان کا انتظام اقوام متحدہ کے ایک ادارے کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ادارہ بامر مجبوری یہ انتظام سنبھالے ہوئے ہے اور مہاجرین بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہیں۔ زندگی کی آسائشوں سے وہ بالعموم محروم ہیں اور نہ گھر کے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔ عرب ممالک بہرحال اقوام متحدہ پر کڑی نکتہ چینی تو کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان بے گھر فلسطینیوں کے لئے مناسب انتظام نہیں کرتی لیکن وہ خود انہیں اپنانے کے لئے تیار نہیں ہوتے، نہ ان کے مصائب کے ازالے کے لئے کوئی اقدامات ہی کرتے ہیں۔ اہل فلسطین ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے۔ اب تک (یعنی ۱۹۷۶ء تک) ایک نئی نسل کیمپوں میں پیدا ہو کر جوان ہو چکی ہے۔ اس پوری نسل کا کیا ہو گا؟ اور بات ایک نسل کی نہیں، دوسری نسل ان کے پہلو بہ پہلو تیار ہو رہی ہے۔ ان کا کیا بنے گا؟ کون ذمہ دار ہے اس کا؟ یہ نسلیں کس گناہ کی پاداش میں "قتل" ہو رہی ہیں؟ ہر گزرنے والا سال عربوں سے یہ سوال پوچھتا ہے ——— اور ان کا دامن جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن عرب ایک دوسرے کا دامن کھینچ کھینچ کر انہیں تار تار کرنے سے ہنوز فارغ نہیں ہو سکے اور نہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں تشتت و افتراق کی رَو کو روک سکیں گے۔

فلسطین کے مسئلہ پر عرب سربراہ کئی بار مل بیٹھے ہیں اور عرب لیگ کے نمائندوں نے بھی بارہا سر جوڑے ہیں۔ اُنہوں نے مشترکہ دفاع تک کا منصوبہ تیار کیا ہے لیکن کوئی عملی کام نہیں ہو سکا کیونکہ یہی طے نہیں ہو پاتا کہ فلسطین کو آزاد کیسے کرایا جائے۔ اس تجویز کو قبول نہیں کیا گیا کہ عرب ممالک مشترکہ جد و جہد کریں۔ حالانکہ مل جُل کر ہی یہودیوں کے خلاف مؤثر محاذ قائم کیا جا سکتا ہے۔ یہ تجویز بار بار پیش کی جاتی ہے کہ فلسطینیوں کو منظم کر کے انہیں یہودیوں کے خلاف لڑنے دیا جائے اور پھر ان کی امداد کی جائے۔ گویا جس طرح الجزائری مجاہد فرانس کے خلاف لڑے، اسی طرح فلسطینی یہودیوں کے خلاف لڑیں۔ یہ درست، لیکن اس تجویز کا محرک جذبہ یہ ہے کہ اس طرح فلسطین کا جو حصہ اُردن کے پاس ہے وہ اُردن سے "آزاد" ہو جائے گا اور اُردن، شرق اردن بن کے رہ جائے گا۔ اسی جذبہ کے تحت حال ہی میں یہ تجویز پیش ہوئی کہ مصر کی فوجیں بھی اُردن میں متعین کی جائیں تاکہ وہ یہودیوں کے خلاف لڑ سکیں۔ اس کا جواب بجا طور پر، اُردن نے یہ دیا کہ اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اوّل تو ہر ملک کی

فوجیں ان سرحدوں پر موجود ہونی چاہئیں جو اسرائیل سے ملتی ہیں، دوسرے مصر کو اسرائیل ہی کے مقابلے کا خیال ہے تو وہ اپنی فوجیں یمن سے کیوں واپس بلا نہیں لیتا۔ واضح رہے کہ مصر کی چالیس ہزار سے زائد فوج کئی سالوں سے یمن میں مقیم ہے اور معزول امام یمن اور شاہ سعود کے خلاف برسرپیکار ہے۔ یہ فوج اسرائیل کے خلاف کام میں لائی جا سکتی ہے اور لائی جانی چاہیئے۔ لیکن عربوں کی باہمی رقابتوں کا یہ عالم ہے کہ ان کی قوت ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے ہی ضائع ہو رہی ہے۔

اسرائیل کی زبانی مخالفت اور باہمی نا اتفاقی کا سنگین نتیجہ ۱۹۵۶ء میں نکلا جب اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مل کر مصر پر حملہ کر دیا۔ مصر ان میں سے کسی ایک طاقت کا بھی مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ لیکن روس کی مداخلت اور روس اور امریکہ کی مسابقت کے طفیل اس کھلی جارحیت کو روک دیا گیا۔ اور اقوام متحدہ نے مصر اور اسرائیل کی سرحد پر بین الاقوامی فوج متعین کر دی۔ اس جارحیت کا ضمنی نتیجہ یہ نکلا کہ مصر نے نہر سویز کو اپنی تحویل میں لے لیا اور اس آبی شاہ راہ پر بین الاقوامی تسلط ختم ہو گیا۔ اس طرح ان سازشوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، جو اس تسلط کے طفیل ہوتی رہتی تھیں۔ یہ پہلو بڑا خوش آئند ہے لیکن اصل مسئلہ جوں کا توں ہے۔ نہر سویز پر قبضہ کر لینے سے اسرائیل کی ناکہ بندی نسبتاً اور مضبوط ہو گئی لیکن محض اس طرح کی ناکہ بندی فیصلہ کن ثابت نہیں ہو سکتی۔ بین الاقوامی سیاست کا یہ عملی سبق بالکل نہیں بھولنا چاہیئے کہ کسی ملک کی ناکہ بندی کبھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا۔ تو اس وقت اقوام عالم نے اس کی ناکہ بندی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ جنوبی افریقہ کی ناکہ بندی کب سے ہو رہی ہے۔ رہوڈیشیا کی ناکہ بندی کا بھی فیصلہ ہو چکا ہے ناکہ بندی کے یہ فیصلے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھے کیونکہ بہت سی قومیں ان کی مؤید تھیں۔ اگر وہ نتیجہ خیز نہیں ہو سکے تو عربوں کی طرف سے اسرائیل کی محدود ناکہ بندی نمایاں طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ناکہ بندی نہ کی جائے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ تنہا ناکہ بندی کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہے۔ امریکہ اس ناکہ بندی میں نہ صرف شریک نہیں، وہ اس کے برخلاف ہے۔ چنانچہ عرب ایک راستہ بند کرتے ہیں تو امریکہ کے ہاتھوں کئی در کھل جاتے ہیں اور یہ در مسلسل کھل رہے ہیں۔ یہ سب کچھ عرب بھی جانتے ہیں اور دنیا ساری بھی جانتی ہے۔

اسرائیل بہت بڑا خطرہ ہے۔ مزید خطرہ یہ ہے کہ اس کی سنگینی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے ——— کبھی سارے فلسطین میں یہودیوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ نہیں تھی۔ اب صرف مقبوضہ فلسطین میں ان کی تعداد بیس لاکھ سے تجاوز کر گئی ہے۔ یہ تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہودی مسلسل اسرائیل میں درآمد کئے جا رہے ہیں۔ اسرائیل کے جارحانہ عزائم اپنی جگہ، محض بڑھتی ہوئی آبادی کے زور پر ایک نہ ایک دن اسرائیل کو مزید علاقے کی ضرورت ہو گی۔ اس کے لئے توسیع ناگزیر ہوتی جا رہی ہے۔ گویا یہودی "مجبور" ہوتے جا رہے ہیں کہ وہ مزید عربی علاقے ہتھیائیں۔ یہ علاقے انہیں عربوں سے فتح کرنے ہوں گے۔ وہ اس کے لئے شبانہ روز کوشش کر رہے ہیں۔ وہ خطرناک جنگی تیاریاں بھی کر رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ آبادی کے لئے جگہ پیدا کرنے کے لئے صحراؤں کو آبادکاری کے قابل بھی بنا رہے ہیں۔ جہاں تک جنگی تیاریوں کا تعلق ہے، اسرائیل امریکہ کی شہ پر اور مدد سے ایٹمی طاقت بننے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے۔ اس چور دروازے سے بھارت کو بھی مدد مل رہی ہے۔ عرب اسے جانتے ہوئے بھی بھارت کو دوست سمجھے جا رہے ہیں۔ جہاں تک صحرائی آبادکاری کا تعلق ہے، اس سے عربوں کے لئے بالعموم اور اردن کے لئے بالخصوص ایک نیا فتنہ

پیدا ہو گیا ہے۔ اسرائیل یہ منصوبہ روبہ عمل لا رہا ہے کہ جھیل گلیلی کا پانی نکال کر اپنے صحراؤں کو مزید یہودیوں کے لئے قابلِ رہائش بنائے۔ اس منصوبے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے اردن جس پر اردن کی معیشت کا دارومدار ہے، خشک ہو جائے اور یہ ملک صحرا بن جائے۔ اردن کے کہنے پر عربوں نے اس کا جواب یہ سوچا ہے کہ جو دریا جھیل گلیلی میں آ کر گرتے ہیں، ان کا رخ وہیں سے ہی موڑ دیا جائے۔ اسرائیلی منصوبے کا یہ ایک حد تک جواب تو ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عرب ایسا کر گذریں گے؟ اسرائیل نے فیصلہ ہی نہیں کیا، وہ تو عمل بھی کر رہا ہے۔ عرب باتیں ہی کئے جا رہے ہیں۔ وہ اگر باتیں ہی کرتے تو توقع ہو سکتی تھی کہ آگے چل کر عمل کا مرحلہ بھی آ جائے گا۔ لیکن وہ باتیں کرتے کرتے آپس میں الجھ جاتے ہیں۔ اور اسرائیل کو سپاہیانہ ڈال دیتے ہیں۔ یہ اس مسلسل جارحیت کا جواب نہیں جو برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے اسرائیل کی شکل میں عربوں کے خلاف روا رکھی گئی۔ اور جو کسی وقت بھی عربوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن عرب شاید یہ تو سمجھ گئے ہیں کہ ؎

تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں

لیکن یہ راز جانتے وہ کب پائیں گے

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی تربیت و لذتِ نمود میں ہے!

فلسطین کے مرضِ کہن کا چارہ اس کے سوا کچھ نہیں۔

(نوشتہ ۱۹۶۷ء)

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن، عمدہ و دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں) شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۶۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۱۸۰ روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے، یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:۔ فی جلد -/۵۰ روپے
مکمل سیٹ -/۲۰۰ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر

۱۔ داعیانِ اقامتِ دین

روزنامہ جنگ (لاہور) کی ۲۰ اگست ۱۹۸۲ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے:۔

> تحریکِ اسلامی کے سربراہ میاں طفیل محمد نے کہا ہے کہ اسلامی نظام کے نفاذ کا ایک مکمل خاکہ تیار کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور جو لوگ اپنی عملی زندگی سے اس کے نفاذ کے لئے تیار ہوں ان کو ایک جماعت کی شکل دی جائے ...... وہ آج منصورہ میں خدمتِ اسلامی لاہور کے زیرِ اہتمام، تحریکِ اسلامی کے ۴۲ ویں یومِ تاسیس سے خطاب کر رہے تھے۔

آپ آئے دن اخبارات میں اس قسم کے اعلانات پڑھتے ہوں گے کہ "میں نے اپنا نام بدل کر یہ نام رکھ لیا ہے۔ آئندہ مجھے اسی نام سے پکارا جائے"۔ جب ملک میں سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگائی گئی تو جماعتِ اسلامی نے اپنا نام بدل کر "تحریکِ اسلامی" رکھ لیا (اور خدمتِ اسلامی اس کا ایک ذیلی شعبہ قرار پا گیا)۔ ورنہ ان صاحب سے کوئی پوچھے کہ یہ کونسی "تحریکِ اسلامی" ہے جس کا بیالیسواں یومِ تاسیس منایا جا رہا ہے؟ کیا یہ وہی جماعتِ اسلامی نہیں جس کی بنیاد ۱۹۴۱ء میں رکھی گئی تھی؟

۲۔ آج کل ملک میں یہ بحث بھی چل رہی ہے کہ اسلام میں سیاسی پارٹیوں کی اجازت ہے بھی یا نہیں۔ میاں صاحب نے اس ضمن میں یوں فرمایا:۔

> جو لوگ ملک میں اسلامی نظام کی بات کریں اور دوسری طرف ملک میں جماعتی نظام کو تہس نہس کر دیں۔ ملک میں سیاسی جماعتیں ختم کر دیں، وہ کیسے اسلامی نظام نافذ کر سکتے ہیں۔ (ایضاً)

سیاسی جماعتیں، پارٹیوں کے وجود کے حق میں سیاسی دلائل پیش کرتی ہیں۔ لیکن یہ حضرات چونکہ "اقامتِ دین" کے قیام کے مدعی ہیں اس لئے یہ اس کے لئے اسلامی دلیل دیتے ہیں۔ وہ دلیل کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔ میاں صاحب نے کہا:۔

> نبی موجود ہو تو اس کی موجودگی میں اس کی جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعت قائم کرنا درست نہیں لیکن صحابہؓ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں۔ اس لئے مسلمانوں کے اندر جماعت کو حرام قرار نہیں

دیا جا سکتا۔ (ایضاً)

معلوم نہیں کہ یہ رپورٹنگ کا سہو ہے یا میاں صاحب کا تسامح، پورا فقرہ [illegible] ہونا چاہیے تھا:۔

لیکن صحابہؓ نے اپنی اپنی جماعتیں بنائیں ان میں سے ایک کا نام جماعتِ اسلامی تھا۔

آپ غالباً حیران ہوں گے کہ میاں صاحب نے اپنے ـــــــ موقف کی تائید میں صحابہ کبارؓ کو ملوث کرنے کی جرأت کس طرح کر لی؛ لیکن یہ ان کے ہاں کوئی نئی بات نہیں۔ ان کے امیرِ اوّل (سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم) اس سے بھی ایک قدم آگے جایا کرتے تھے۔ ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ ان کی جماعت کے بعض مقتدر راہنماؤں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرتے وقت، مودودی مرحوم پر یہ اعتراض کیا کہ آپ نے جماعت سازی کے وقت جو اصول پیش کئے تھے، اب حصولِ اقتدار کی کوششوں میں سب کو بالائے طاق رکھ دیا ہے!

آپ کو معلوم ہے مودودی (مرحوم) نے اس کا کیا جواب دیا تھا؛ انہوں نے کہا تھا (اور سینے پر ہاتھ رکھ کر سینے کہ کیا کہا تھا)۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں نے اصول شکنی کی ہے تو کونسا انوکھا کام کیا ہے..... (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) رسول اللہؐ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ مثلاً

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآنِ مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ۔ امام قریش میں سے ہوں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ (ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۵۶ء۔ صفحہ ۲۳)

اسلام کا دوسرا بنیادی اصول راستبازی اور حق گوئی ہے۔ اس سلسلہ میں مودودی مرحوم نے فرمایا تھا۔

> راستبازی و صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۵۴)

اور اس کی تائید میں کہا تھا کہ

> اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلمہؓ کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؛ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ حجاج بن علاط نے غزوۂ خیبر

کے موقعہ پر مکہ والوں کے قبضہ سے اپنا مال نکال کر لے آنے کے لئے جھوٹ سے کام لینے کی اجازت مانگی اور حضورؐ نے ان کو بھی اجازت عطا فرمائی۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء۔ ص۵۵)

سو، جن کے پیر و مرشد اس حد تک آگے بڑھ جائیں، ان کے معتقدین اگر یہ کہہ دیں کہ صحابہؓ نے بھی اپنی اپنی جماعتیں بنائی تھیں، تو کونسی انوکھی بات ہے!

اسلام میں جماعت سازی (پارٹی بازی) کی ممانعت کے سلسلہ میں میاں طفیل محمد صاحب کے سامنے خدا اور رسولؐ کے ارشادات پیش کرنا تو عبث ہے لیکن مودودی (مرحوم) کے فیصلہ کو تو انہیں ضرور تسلیم کر لینا چاہیئے۔ جب انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت شروع کی تھی تو لکھا تھا کہ

قوم تو پہلے ہی ایک جمیعت ہے۔ اس جمیعت کے اندر کوئی الگ جمیعت، الگ نام سے بنانا، اور مسلمان، اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتیں اور فرقوں کی عصبیت پیدا کرنا دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے، جمیعت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آتی ہیں وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آتیں۔ (پیغام حق۔ فروری ۱۹۳۸ء۔ ص۸۳)

لیکن اس کے جواب میں اگر میاں صاحب یہ کہہ دیں کہ ہمارے لئے مودودی (مرحوم) کا ۱۹۳۸ء والا اسلام سند نہیں ۱۹۴۱ء والا اسلام سند ہے جب انہوں نے خود اپنی الگ پارٹی (جماعتِ اسلامی) بنائی تھی، تو ہم کیا کہہ سکیں گے؟ ان کے جھولے میں ہر ٹائپ کا اسلام موجود رہتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ (اور طلوعِ اسلام میں پیش کی جاتی رہی ہیں) لیکن اس مقام پر ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ عورتوں کے سیاسی نظام میں حصّہ لینے کے متعلق مودودی (مرحوم) نے کہا تھا:۔

مجالسِ دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی تقلید ہے۔ اسلام نے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظام ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔ (دستوری تجاویز۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ بابت نومبر ۱۹۶۴ء)

اس کے بعد جب محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) مجلسِ دستور ساز کی رکنیت کے لئے نہیں بلکہ مملکت کی صدارت کے لئے بطور امیدوار کھڑی ہوئیں تو جماعتِ اسلامی نے ان کی بھرپور حمایت کی اور کہا کہ ان کا یہ انتخاب خلافِ اسلام نہیں ہوگا۔ اب میاں صاحب (اپنی محولہ بالا تقریر میں) فرماتے ہیں:۔

ان لوگوں کی مت ماری گئی ہے جو ایک عورت کو مادرِ ملّت بنا کر ایم۔ آر۔ ڈی میں لئے پھرتے ہیں۔ (جنگ۔ مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۸۶ء)

ہمیں محترمہ بیگم نصرت بھٹو کی سیاست سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہم بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان حضرات کا سیاسی اسلام کس طرح ہر مصلحت کے قالب میں ڈھل جاتا ہے!